سہ ماہی مجلہ

بحث و نظر

حیدرآباد

بانی : حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ

مدیر : خالد سیف اللہ رحمانی

سہ ماہی مجلہ بحث ونظر حیدرآباد

شمارہ نمبر : ۱۱۳۷ / ۳۷	جولائی — ستمبر ۲۰۲۴ء	ذوالحجہ ۱۴۴۶ھ — محرم الحرام ۱۴۴۷ھ

مدیر

خالد سیف اللہ رحمانی

زرِتعاون

اندرون ملک

ایک شمارہ: 50 روپے

سالانہ: 180، بذریعہ رجسٹری: 220

سہ سالہ: 500، بذریعہ رجسٹری: 600

بیرونِ ملک

ایشیائی ممالک کیلئے سالانہ: 20 امریکی ڈالر

یورپ، امریکہ، افریقہ کے لئے :

سالانہ: 30 امریکی ڈالر

ترسیل زر اور خط وکتابت کا پتہ

Khalid Saifullah Rahmani, Baitul Hamd, H.No:16-182/1, Quba Colony,
Po:Pahadi Shareef, Hyd. T.S 500005, Ph: 9989709240 E-mail: ksrahmani@yahoo.com

چیک / ڈرافٹ پر صرف: "Khalid Saifullah" لکھیں

کمپیوٹر کتابت وسرورق: القلم گرافکس، حیدرآباد ، فون نمبر: 7659841514

فہرست مضامین

● ● ●

بسم اللہ الرحمن الرحیم

افتتاحیہ

جس دین کے ہم حامل ہیں، یہ ہم تک واسطوں سے پہنچا ہے، ایسا نہیں ہوا کہ ہر شخص پر براہ راست اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام نازل کئے ہوں؛ بلکہ فرشتوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اللہ کے پیغمبروں تک پہنچی، پھر انبیاء نے خدا کا پیغام اپنے رفقاء کو سنایا، رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ دین حق کا آخری، مکمل اور بے آمیز ایڈیشن انسانیت کو ملا، سب سے پہلے اس امانت کا بوجھ صحابہؓ کی برگزیدہ جماعت نے اُٹھایا، یہ ایسے پاکباز، ایثار پیشہ اور بے نفس لوگ تھے، کہ کسی اور نبی کے حصہ میں ایسے رفقاء میسر نہ آئے، اور اس میں مبالغہ نہیں کہ انبیاء کے سوا چشم فلک نے ان کی نظیر نہیں دیکھی، پھر ہر عہد کے بہتر لوگ اس امانت نبوی کے حامل اور امین بنتے رہے، اسی کو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہر نسل کے بہتر لوگ اس بارِ امانت کے حامل بنیں گے، (۱) چوں کہ یہ آخری دین ہے، اور اسے قیامت تک انسان کی رہنمائی کا فریضہ انجام دینا ہے، اس لئے من جانب اللہ اس کا نظم ہوتا رہا کہ ہمیشہ اُمت میں ایسی شخصیتیں پیدا ہوتی رہیں، جو ایک طرف علم وفضل کے اوجِ کمال پر تھیں اور دوسری طرف ورع وتقویٰ اور خشیتِ الٰہی میں بھی وہ اپنے اہل زمانہ پر فوقیت رکھتی تھیں، یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف رسول اللہ ﷺ نے اشارہ فرمایا کہ ہر صدی میں ایسا شخص یا ایسے اشخاص پیدا ہوتے رہیں گے، جو اہل باطل کی تاویلات اور آمیزشوں سے دین کی حفاظت فرمائیں گے، (۲) چنانچہ محدثین، فقہاء اور ائمۂ متبوعین اور ہر عہد کے مصلحین یقیناً اس پیشین گوئی کے مصداق ہیں اور ہر دور کے دین کے مزاج شناس علماء اس میراث کے حامل رہے ہیں۔

اب اس وقت عالمی سطح پر اس بات کی کوشش کی جارہی ہے، کہ علماء کو مجروح کیا جائے، ان کو نکما، کم فہم، اُمت کے لئے بوجھ، جذباتی اور مشتعل مزاج، نیز شدت پسند ثابت کیا جائے، اس سلسلہ میں صہیونی لابی اور ہندوستان کی فسطائی طاقتیں خاص طور پر سرگرم ہیں؛ بلکہ اس سلسلہ میں اس مہم کے لئے ایک دوسرے کا

بھرپور تعاون کررہی ہیں، دینی مدارس پر جو اعتراضات کئے جارہے ہیں اور ان کو ہدف طعن بنایا جارہا ہے، یہ اسی ناروا کوشش کا ایک حصہ ہے اور اب طالبان کی آڑ میں اس موضوع کو اور بھی ہوا دی جارہی ہے۔

اعداء اسلام کی طرف سے مدارس اور علماء کے خلاف یہ مہم جوئی خود اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ اسلامی عقیدہ، اسلامی ثقافت اور اسلامی تشخصات کی حفاظت اور مسلمانوں کو مسلمان باقی رکھنے میں اس طبقہ کا کتنا بڑا حصہ ہے، جو آج دشمنوں کی نگاہ میں سب سے زیادہ کھٹک رہا ہے اور وہ یہ محسوس کررہے ہیں کہ جب تک یہ درویش صفت اور مادی وسائل کے اعتبار سے خستہ حال؛ لیکن اسلام کے لئے ہر طرح کی قربانی پر آمادہ گروہ باقی رہے گا، ممکن نہیں کہ مسلمانوں کے عقیدہ وایمان کو اغوا کیا جاسکے اور انھیں مغربی یا زعفرانی تہذیب میں جذب کیا جاسکے، یہ ایسا سخت جان گروہ ہے کہ اسے بیگانے بھی برا کہتے ہیں اور جو اپنے ہیں وہ بھی اس پر تحقیر وملامت کا تیر پھینکنے سے نہیں چوکتے، بے گھر، یا خستہ حال گھر کے مالک، بہت سے اسباب عیش جو آج زندگی کی ضرورت کہلاتے ہیں، ان کے کام تو کیا، نام سے بھی نابلد، جہاں دو چار گھر مسلمان موجود ہوں، خواہ سڑکیں نہ ہوں، بجلی نہ ہو اور دوسری سہولتیں بھی نہ ہوں، مسجد کے چبوترے پر بوریہ بچھائے وہیں فروکش، خاموش اور غیر محسوس طریقہ پر کام میں مصروف؛ لیکن آہستہ آہستہ اس کی تعلیم اور اس کی صحبت سے پوری آبادی کا رنگ ڈھنگ بدل جاتا ہے، عقیدہ کی اصلاح ہوتی ہے، لوگ فسق اور گناہ سے توبہ کرتے ہیں، چھوٹے چھوٹے بچے اسلامی وضع کا نمونہ بن جاتے ہیں، جو بوڑھی پیشانیاں سجدہ کی لذت سے ناآشنا تھیں، وہی اتباعِ سنت کا مظہر بن جاتی ہیں، ان کے ذریعہ نہایت خاموش، ٹھوس، دوررس اور وسیع الاثر انقلاب پورے سماج میں آتا ہے اور آہستہ آہستہ نیچے سے اوپر تک کی سطح پر ایک ایسا انقلاب رونما ہوتا ہے، کہ چند سال پہلے تک اس کا تصور بھی دشوار تھا، یہی وہ حقیقت ہے جو اسلامی تشخصات سے بیر رکھنے والوں کی آنکھوں میں چبھتی ہے۔

روس میں جب کمیونسٹ انقلاب آیا تو اس کی ابتداء اسی طرح ہوئی کہ علماء کے خلاف بہتان باندھے گئے، بدگمانیاں پھیلائی گئیں، ان کے بارے میں بے سروپا باتیں مشتہر کی گئیں اور عوام اور علماء کے درمیان ایک خلیج پیدا کردی گئی، یہ خلیج اتنی بڑھی کہ مریدوں نے اپنے پیر اور مصلیوں نے اپنے امام کے کام خود تمام کئے، اس کے بعد دشمنانِ دین کے لئے کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی اور انھوں نے بہت آسانی سے دلوں میں الحاد ودہریت کا تخم بودیا اور اس طرح وہ اشتراکی انقلاب رونما ہوا، جس کی خونچکاں داستان اہل نظر

کی نظر سے مخفی نہیں، اب عالمی سطح پر اسی تجربہ کو دہرانے کی کوشش کی جارہی ہے اور چوں کہ ہندوستان مدارس کا مرکز اور علم دین کا سرچشمہ ومنبع بنا ہوا ہے، اس لئے یہاں بھی ایسی سعی نامسعود جاری وساری ہے۔

غیروں کی عیاری اور اپنوں کی سادگی دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ ہمارے بہت سے اچھے خاصے پڑھے لکھے اور بہ ظاہر زمانہ آگاہ لوگ بھی بے تکلف اس سازش کا شکار بن جاتے ہیں، اور وہ بھی ان مدارس کے خدام اور ان کے فضلاء کو اپنی کم نگاہی کی وجہ سے کم نگاہی سے دیکھنے لگتے ہیں، مولویوں پر اعتراض کرنے کو بہت سے لوگ گویا پیدائشی حق سمجھتے ہیں، مگر یاد رکھنا چاہئے کہ علماء کے اعتماد کو مجروح کرنا دراصل دین کو مجروح کرنے کے مترادف ہے، اس میں شبہ نہیں کہ بہت سی کمزوریاں اس طبقہ میں ہوسکتی ہیں، ممکن ہے کسی خاص مدرسہ سے آپ کی شکایت بجا ہو، ہوسکتا ہے کہ کسی خاص عالم پر آپ کی خفگی برحق ہو؛ لیکن اس شخصی اور جزوی کوتاہی کو پورے طبقۂ علماء اور مدارس سے بدگمانی کا ذریعہ بنانا یا اپنے گھر کو آپ آگ لگانے کے ہم معنی ہے، دیکھنا یہ چاہئے کہ بہ حیثیت مجموعی اس گروہ سے کیا نفع پہنچ رہا ہے؟

خالد سیف اللہ رحمانی
(بیت الحمد، شاہین نگر، حیدرآباد)

۱۷؍جمادی الاول ۱۴۴۶ھ
۲۰؍نومبر ۲۰۲۴ء

○○○

نئی تعلیمی پالیسی کے اثرات اور مسئلہ کا حل
غور وفکر کے چند اہم پہلو

خالد سیف اللہ رحمانی

یہ استاذ گرامی حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کا فکر انگیز کلیدی خطبہ ہے، جو آپ نے ۹/نومبر ۲۰۲۴ء مطابق ۶/جمادی الاولیٰ ۱۴۴۶ھ کو جامعۃ اسلامیہ قاسمیہ دار العلوم بالا ساتھ، سیتا مڑھی، بہار میں اسلامک فقہ اکیڈمی کے ۳۳/ویں سالانہ فقہی سیمینار میں پیش کیا تھا، اس کا تعلق موجودہ دور میں ملت اسلامیۂ ہند کے ایک اہم مسئلہ سے ہے، جو تمام علماء، اہل دانش اور فکر مند مسلمانوں کے لئے لائق مطالعہ اور قابل استفادہ ہے، اسی نقطۂ نظر سے اس خطبہ کو یہاں شامل کیا جا رہا ہے۔ (عبید اختر رحمانی)

الحمد لله رب العالمين والصلوٰة والسلام على رسوله الكريم
وعلىٰ آله وصحبه أجمعين ومن تبعهم باحسان الى يوم الدين۔

حضرات علماء کرام اور دانشوران ذی احترام!

اللہ کا شکر ہے کہ آج ہم سب اسلامک فقہ اکیڈمی کے ۳۳/ویں فقہی سیمینار میں جمع ہیں، ایک طرح سے اکیڈمی کا یہ سیمینار اپنی جائے پیدائش میں ہو رہا ہے؛ کیوں کہ اسی خطہ سے بانی اکیڈمی کا تعلق تھا، ملک کی مختلف ریاستوں میں اکیڈمی کے سیمینار منعقد ہوتے رہے ہیں، اکیڈمی کے سیمیناروں کو صرف ایک جگہ مرتکز نہ کرنے کی مصلحت یہ تھی کہ مسائل شرعیہ پر غور وتحقیق کا جو قافلہ وجود میں آئے، اس میں ہر علاقہ کے اہل علم کی شرکت ہو اور اس جد وجہد کو نیا خون دستیاب ہوتا رہے، بانی اکیڈمی کی اس سوچ کا اثر آج ہم ملک کے چپہ چپہ

میں دیکھ رہے ہیں، بہار چوں کہ اس علمی تحریک کا داعی ہے، اور شرکاءسیمینار میں بڑی تعداد بہار کے بہ شمول مشرقی علاقوں کی ہوتی ہے، اسی لحاظ سے یہاں کئی سیمینار منعقد ہونے چاہئے تھے؛ لیکن بڑے تعلیمی اداروں کی قلت اور آمدورفت کی سہولتوں کے فقدان کی وجہ سے اس سے پہلے صرف ایک یعنی ۱۱/رواں سیمینار ۱۹۹۹ء میں منعقد ہوسکا، اور اس وقت یہ دوسرا سیمینار منعقد ہورہا ہے، اب بہار میں دربھنگہ ائیرپورٹ فعال ہوچکا ہے اور کئی اور ائیرپورٹس کی تیاری چل رہی ہے؛ اس لئے بعض دشواریاں آسان ہوگئی ہیں، اور امید ہے کہ مستقبل میں بہار کے کئی شہروں میں سیمینار منعقد ہوں گے۔

ہندوستان میں صوبۂ بہار اپنی مردم خیزی کے لئے ہمیشہ مشہور اور اہم رہا ہے، بہار اصل میں ''ویہار'' تھا، اس نام سے بدھ درویشوں کی خانقاہ کو موسوم کیا جاتا تھا، اس خطہ میں چوں کہ ایسی خانقاہوں کی کثرت تھی؛ اسی لئے بدھ عہد میں اس کا نام ''ویہار'' پڑ گیا تھا، رفتہ رفتہ ''و''، ''ب'' سے بدل کر بہار ہوگیا، ہندو عہد میں ایک زمانہ تک اس خطہ کو مگدھ بھی کہا جاتا تھا---اس لفظ سے اس کی مذہبی حیثیت ظاہر ہے، دنیا کے تین قدیم مذاہب جین مت، ہندو مت اور بدھ مت کی تاریخ اس خطہ سے جڑی ہوئی ہے، ہندو عہد میں پٹنہ جو بہار کی موجودہ راجدھانی ہے، ملک کا صدر مقام تھا، جو پاٹلی پوترا اور پھر پاٹلی پتر کہلایا، بڑے بڑے راجاؤں اور مہاراجاؤں سے اس شہر کی رونق تھی، بدھ عہد کی بہت بڑی تعلیم گاہیں نالندہ اور وکرم شیلا اسی صوبہ میں واقع تھیں، جن کی باقیات اب زمین کی کھدائی میں مل رہی ہیں، اور ان باقیات سے ان دانش گاہوں کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے، کہا جاتا ہے کہ جناب گوتم بدھ کو اسی خطہ علم ومعرفت میں گیان حاصل ہوا تھا؛ چنانچہ گیا میں اب بھی ان کی یادگار موجود ہے، مسلم عہد حکومت سے پہلے کی تاریخ میں دو بڑے حکمراں گزرے ہیں، جن کی مملکت کا دائرہ نہایت وسیع تھا، اور جن کا عدل وانصاف، رعایا کے ساتھ حُسن سلوک اور امن وامان کے قیام کی کوششیں ضرب المثل تھیں، چندر گپت اور اشوک، یہی پاٹلی پتر ان کا پایۂ تخت تھا، اور یہیں سے ان کے انصاف کا چشمہ جاری ہوا تھا۔

بہار میں مسلمانوں کی آمد:

بہار چوں کہ شمال مشرق کے علاقہ میں واقع ہے اور ہندوستان میں اسلام، مبلغین اسلام کے ذریعہ جنوب کے ساحلی علاقہ اور فاتحین کے ذریعہ شمال مغربی علاقہ میں پہلے پہنچا؛ اس لئے بہار و بنگال تک اسلام کی بادِ نسیم دیر سے خلجی عہد میں پہنچی، جب اختیار الدین محمد بختیار خلجی نے ۵۹۶ھ مطابق ۱۱۹۹ء میں اس علاقہ پر فوج کشی کی اور سیاسی فتح مندی ہی پر قناعت نہیں کی؛ بلکہ اس علاقہ میں اسلام اور اسلامی تہذیب وثقافت کی

اشاعت وترویج پر بھی توجہ دی، اس کے بعد سے ہی اس خطہ کی تقدیر مسلمان فرماں رواؤں سے وابستہ ہوگئی، یہاں تک کہ اورنگ زیب عالمگیرؒ نے ۱۷۰۴ء میں اپنے پوتے عظیم الشان کو بہار واُڑیسہ اور بنگال کا فرماں روا مقرر کیا، اس کو موجودہ پٹنہ شہر بہت بھایا اور اس نے اسے ''عظیم آباد'' سے موسوم کیا۔

صوفیاء وعلماء کا مرکز:

بہار اپنے ابتدائی مسلم دور سے ہی علماء اور صوفیاء کا مرکز بنا رہا، بہار کے ایک مشہور صوفی شیخ خضر پارہ کی شہرت ہندوستان کے مغربی علاقہ تک پہنچی ہوئی تھی، یہاں تک کہ خواجہ معین الدین اولیاءؒ (متوفی: ۷۲۵ھ) نے بھی آپ سے استفادہ کیا، پھر سلطان ناصر الدین (متوفی: ۱۲۶۶ء) کا دَور وہ عہدِ میمون ہے، جس میں بہار پورے برصغیر کے علماء وصوفیاء کا قبلۂ عقیدت بن گیا، جب امام تاج فقیہ کے پڑپوتے مخدوم شرف الدین یحیٰی منیریؒ (متوفی: ۷۸۲ھ) کی ولادت ہوئی، وہ ایسے صاحب نسبت بزرگ تھے کہ ان کی خانقاہ برصغیر کے طول وعرض میں علماء اور طالبین ہدایت واصلاح کا سب سے بڑا مرجع تھی، خود فیروز شاہ تغلق (متوفی: ۱۳۸۸ھ) ان کا بے حد معتقد تھا، اور اسی نے ان کی خانقاہ تعمیر کرائی، شیخ مظفر شمس (متوفی: ۷۸۸ھ) اور شیخ منہاج راستی وغیرہ اسی سلسلہ کے بزرگوں میں تھے، جن کے وجود سے طویل عرصہ تک یہ خطہ مطلع انوار بنا رہا۔

جہاں یہ خطہ صاحبِ دل صوفیاء اور درویشوں کے لئے مشہور ہے، وہیں محقق علماء اور صاحبِ نظر فقہاء کے لئے بھی اس خطہ کو خاص شہرت حاصل رہی ہے، شیخ بڈھن حقانیؒ ہندوستان کی علمی تاریخ کا ایک اہم نام ہے، جو مُنیر کے رہنے والے تھے، آپ کا حلقۂ دَرس اس قدر مقبول تھا کہ شیخ طاہر ملتانی آپ سے استفادہ کے لئے ملتان سے یہاں پہنچے، شیر شاہ سوری آپ کا ایسا معتقد تھا کہ اپنے ہاتھوں سے آپ کی جوتیاں سیدھی کرتا تھا، فرقہ مہدویہ کے بانی شیخ علائی اور علماءِ حق کے درمیان مناظرہ ہوا تو سلیم شاہ نے حَکَم کی حیثیت سے آپ کو دعوت دی، مغلوں کے دور میں بھی علماء بہار کی امتیازی شان قائم رہی، شاہ جہاں اپنے لڑکے اورنگ زیب عالمگیرؒ کی تعلیم وتربیت کے لئے کسی عبقری عالم کی تلاش میں تھا، یہ تلاش ملاّ موہن بہاریؒ کی صورت میں ثمر آور ہوئی، اورنگ زیب اپنے اس استاذ سے بہت زیادہ متأثر تھے، اورنگ زیب کی لڑکی زیب النساء مخفی اپنی ذہانت وذکاوت اور شعروسخن کے ذوق کے لئے معروف تھی، اورنگ زیب کی نگاہ جوہر شناس نے اپنی اس لڑکی کے اتالیق کی حیثیت سے دربھنگہ کے ملا ابوالحسن کا انتخاب کیا۔

پھر اورنگ زیب عالمگیر نے فتاویٰ عالمگیری کی ترتیب کا جو کام کرایا، جو اسلامی ہند کا سب سے نمایاں

اور یادگار علمی کارنامہ ہے، اس کام کے لئے اس خدا ترس، صاحب نظر اور علم پرور بادشاہ نے پورے ملک سے اہم اور ممتاز علماء واصحاب بصیرت فقہاء کا انتخاب کیا تھا، سرزمین بہار کے لئے مایۂ افتخار ہے کہ ان مرتبین میں چار چار نام علماء بہار کے ہیں، ملا فصیح الدین پھلواروی، شیخ ریاض الدین بھاگلپوری، قاضی عنایت اللہ مونگیری اور ملا ابوالحسن دربھنگوی۔

مغلوں ہی کے عہد میں ہندوستان کے علمی اُفق پر بہار سے ایک ایسا خورشید علم ومعرفت طلوع ہوا، جس کے علم وفضل کو نہ صرف برصغیر میں تسلیم کیا گیا؛ بلکہ پوری دنیائے علم اس چرچے سے گونج اُٹھی، میری مراد ملا محب اللہ بہاریؒ (متوفی: ۱۷۰۷ء) سے ہے، جن کی تالیفات، مسلم الثبوت اور سلم العلوم کو ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ وہ اپنے فن میں بے نظیر سمجھی گئیں، اور انہیں عہد عالمگیری میں قاضی القضاۃ جیسے اہم اور باوقار عہدہ پر فائز کیا گیا، پھر ماضی قریب میں حدیث اور مختلف فنون میں علماء بہار کی جو نمایاں خدمات رہی ہیں، ان سے کوئی زمانہ آگاہ شخص بے خبر نہیں رہ سکتا، یہی وجہ ہے کہ بہار اہل علم کا مرکز تھا، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے بھی بہار کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا ہے: ''بلدۂ بہار کہ مجمع علماء بود'' (انفاس العارفین: ۶۲) اس سے اس خطہ کی اہمیت اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ترہت کا علاقہ:

بہار کا مشرقی علاقہ جو گنگا کے ساحل سے شروع ہو کر نیپال کی ترائی تک جاتا ہے، ''ترہت'' کہلاتا تھا، اس میں نیپال کا بھی کچھ حصہ شامل تھا، اب ہمالیائی مملکت نیپال کے وجود میں آنے کے بعد ترہت کا علاقہ بھی محدود ہو گیا اور بہار کے چند مشرقی اضلاع اس میں باقی رہ گئے، اس علاقہ کو ''متھلا'' بھی کہا جاتا ہے اور قدیم دور میں یہ خطہ ''تیر بھگت'' بھی کہلاتا تھا، ان ناموں کا رشتہ ایک حد تک ہندو تصورات سے وابستہ ہے، منشی بہاری لال فطرت نے ہندوؤں کی مذہبی کتاب ''بشن پُران'' کے حوالہ سے لکھا ہے کہ راجہ نیمی مہاراج اکھچواک سورج بنسی کے بڑے بیٹے تھے، جو ترہت کے حکمراں تھے، یہ بعض ہندو بزرگوں کی بددُعا سے لاولد مر گئے؛ چنانچہ اس راجہ سے وابستہ مذہبی شخصیتوں نے اس کی لاش کی منتر پڑھ کر مالش کرنی شروع کی اور خدا کی قدرت سے اس لاش سے ایک لڑکا ظاہر ہوا، جس کا نام ''میتھ'' رکھا گیا، جو نیمی کے بعد فرماں روا ہوا، یہ جب بالغ ہوا تو اس نے اس علاقہ کو اپنے آپ سے منسوب کر کے اس کا نام ''متھلا'' رکھ دیا (آئینۂ ترہت: ۸) اس واقعہ میں جو خلاف عقل وقیاس باتیں ہیں، وہ ظاہر ہیں؛ لیکن بہر حال اس سے اس قدر نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ''متھلا'' نام اس

علاقہ کے ایک حکمراں کی نسبت سے ہے، اور یہ بات قرین قیاس ہے؛ کیوں کہ دُنیا کے مختلف علاقوں اور خاص کر ہندوستان میں کئی شہروں کے نام حکمرانوں کی نسبت سے رکھے گئے ہیں۔

''تیر'' کے معنیٰ سنسکرت میں دریا کے ہیں اور بھگت کے ایک معنی واقع ہونے کے بھی ہیں؛ چنانچہ اس علاقہ میں کثرت سے ندیاں اور دریا واقع ہیں؛ اس لئے اس کو تیر بھگت بھی کہا جاتا تھا، پھر ممکن ہے عوام نے تیر بھگت سے ''ترہت'' بنا دیا ہو؛ کیوں کہ جب عوام میں کسی نام کا چلن ہو جاتا ہے تو آہستہ آہستہ اس طرح کا تصرف ہو جایا کرتا ہے؛ لیکن منشی بہاری لال نے یہاں بھی ایک مذہبی نکتہ اخذ کر لیا ہے، ان کا خیال ہے کہ اس علاقہ کے برہمن علم ومعرفت میں ممتاز ہوا کرتے تھے اور تین ویدوں رگ وید، یجر وید اور سام وید سے ''اہوت'' دیتے تھے، یعنی ہوم نامی مذہبی عمل انجام دیتے تھے، پس ''تریا'' سے تین ویدوں اور ''ہت'' سے اس مذہبی عبادت کی طرف اشارہ ہے، اس طرح اس خطہ کا نام ہی ''ترہت'' پڑ گیا، (آئینۂ ترہت: ۹) مہارانا نیمی خاندان کے پینتیسویں حکمراں مہاراجہ پرجت، مہابھارت کی مشہور جنگ میں شریک تھے، ہندو کتابوں میں اس کی صراحت موجود ہے، اس سے بھی اس خطہ کی اہمیت کا اظہار ہوتا ہے۔

ترہت میں مسلمانوں کی آمد:

تاریخی ماٰخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے غیاث الدین تغلق ۷۳۴ھ میں بنگال کی ایک مہم سے واپس ہوتے ہوئے ترہت کے علاقہ میں آیا، اس وقت غالباً ہرسنگھ دیپ اس خطہ کا فرماں روا تھا، اس نے بادشاہ کے خوف سے راہ فرار اختیار کی اور قلعہ چھوڑ ایک جنگل کی راہ لی، بادشاہ نے قلعہ پر قبضہ کیا، اس جنگل کو صاف کرایا اور اس جگہ بستی بسائی، راجہ گرفتار ہوا، بادشاہ نے ملک تلیغہ کے لڑکے احمد خان کو اس علاقہ کی حکومت سپرد کی، یہی غیاث الدین تغلق کی بسائی ہوئی بستی ''دربھنگہ'' سے موسوم ہوئی؛ کیوں کہ سنسکرت میں لکڑی کو ''دارو'' کہتے ہیں، ''بھنگ'' کے معنیٰ کاٹنے کے ہیں، یعنی ایسی جگہ جس کی لکڑیاں کاٹ دی گئی ہیں؛ چنانچہ اس مقام کا اصل نام ''داروبھنگا'' تھا، جو بتدریج ''دربھنگہ'' ہو گیا، (آئینۂ ترہت: ۱۴)

دربھنگہ کی حکومتیں:

اس کے بعد ترہت میں دربھنگہ کو ایک خاص اہمیت اور مرکزیت حاصل ہوتی گئی، اسی اہمیت کا اثر ہے کہ آئین اکبری میں خاص طور پر دربھنگہ کا ذکر ملتا ہے اور اس کا رقبہ ''دو ہزار اڑتیس بیگھ'' بتایا جاتا ہے، غیاث الدین تغلق کے بعد پھر اس علاقہ میں گاہے خود مختار اور گاہے دار الخلافہ دہلی کے باجگزار ہندو راجاؤں کی حکومت

کا سلسلہ جاری رہا،محمد تغلق کے عہد میں بھب سنگھ دیپ راجہ ہوئے،ان ہی کے دور میں حاجی شمس الدین الیاس نے حاجی پور بسایا،تغلقوں کے بعد لودھیوں نے بھی اس علاقہ پر یلغار کی ہے اور ۹۰۰ھ میں سکندر لودھی تر ہت آیا،اس وقت تر ہت کے راجہ نے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوکر چند لاکھ تنکہ سالانہ خراج ادا کرنے پر بادشاہ سے معاملہ طے کرلیا تھا، بادشاہ مبارک خان لوحانی کو خراج کی وصولی پر مامور کر کے خود واپس چلا گیا،مہاراجہ بھب سنگھ کے خاندان نے کم وبیش دوسو سال اس خطہ پر حکومت کی ہے،اس کے بعد مہاراجہ در بھنگہ کا ستارۂ اقتدار چمکا،مہیش ٹھکر کے ایک وفا شعار شاگرد رگھونندن رائے اکبر کے دربار میں حاضر ہوئے اور اپنی مناظرانہ صلاحیت اور علمی لیاقت کی وجہ سے بادشاہ پر اپنے گہرے اثرات چھوڑے، بادشاہ نے رگھونندن رائے کو ۱۵۵۸ء میں تر ہت کی جاگیر عطا کی، لائق شاگرد نے اپنے لائق استاذ مہیش ٹھاکر کو اپنی طرف سے حکومت کا یہ نذرانہ پیش کیا،مہیش کو تو اس سے کچھ خاص دلچسپی نہیں تھی؛ لیکن ان کے صاحبزادے گوپال ٹھاکر نے کاروبار حکومت میں دلچسپی لی اور زمین داری اپنے خاندان کے نام منتقل کرائی، جہانگیر کے عہد میں گوپال ٹھاکر کے بھتیجے پرشوتم ٹھاکر زمین دار ہوئے، یہ زمین داری انگریزی عہد تک باقی رہی اور ۱۷۶۵ء کے بعد جب عظیم آباد، اُڑیسہ اور بنگال کا علاقہ انگریزوں کے سپرد ہوا، اور لارڈ کلایو گورنر جنرل مقرر ہوئے، یہ علاقہ مہاراج در بھنگہ کی زمین داری کے ساتھ انگریزوں کی عملداری میں آ گیا۔

در بھنگہ کا علمی مقام:

بہار میں جن شہروں کی مراکز علم کی حیثیت سے شہرت رہی ہے، ان میں ایک در بھنگہ بھی ہے، اس سلسلہ میں ملا ابوالحسن در بھنگوی کا ذکر اُوپر آ چکا ہے، جو فتاویٰ عالمگیری کے مرتبین میں ہیں، علماء در بھنگہ میں شیخ ابومحمد ہدایت اللہ صدیقی کا بھی ذکر آتا ہے، جن کی علمی منزلت بیرون ہند بھی کی جاتی تھی، بحر العلوم مولانا عبدالعلی فرنگی محلی نے اپنے والد ماجد اور شہرۂ آفاق عالم ملا نظام الدینؒ کی وفات کے بعد در بھنگہ آ کر ان سے کسب فیض کیا، ہندوستان کے علاوہ مصر کے بھی بہت سے علماء نے ان سے علوم اسلامی میں سند حاصل کرنے کو اپنے لئے مایۂ افتخار سمجھتے تھے، مشہور صاحب علم ملا جیونؒ کے بارے میں انگریزی زبان میں ان کے ایک تذکرہ نگار نے لکھا ہے کہ ان کا ننیہالی یا سسرالی تعلق در بھنگہ سے تھا، یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ موجودہ دور میں بھی در بھنگہ اور اس کے گردو پیش کے علاقہ کو علمی اعتبار سے امتیازی حیثیت حاصل ہے، حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ، حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحبؒ (مفتی دارالعلوم دیو بند)، مولانا نذر الحفیظ ندویؒ (استاذ دارالعلوم ندوۃ

العلماء لکھنؤ)، مولانا بدرالحسن قاسمی (مقیم کویت)، مولانا نور عالم خلیل امینیؒ (ایڈیٹر الداعی دیوبند)، مولانا محمد رضوان القاسمیؒ (حیدرآباد)، مولانا محمد قاسم مظفر پوریؒ، مولانا رحمت اللہ ندوی (مقیم قطر)، مولانا سعود عالم قاسمی (علی گڑھ)، مولانا ابوالکلام قاسمی (علی گڑھ)، ڈاکٹر حسین ذوالقرنین (ریاض) اور مولانا ابوالکلام شمسی (پٹنہ) وغیرہ کا تعلق اسی خطہ سے ہے۔

حضرات!

مقام مسرت ہے کہ اکیڈمی کا یہ سیمینار عالم جلیل حضرت مولانا عبدالحنان صاحب قاسمیؒ کے قائم کئے ہوئے بافیض ادارہ جامعہ قاسمیہ بالا ساتھ میں منعقد ہورہا ہے، بالا ساتھ اس علاقے کا ایک علم خیز قصبہ ہے، اور جامعہ قاسمیہ ترہت کی مرکزی درسگاہوں میں سے ہے، پورے علاقے میں یہاں کے فیض یافتہ فضلاء موجود ہیں، اب اس ادارہ نے موجودہ ضرورت کو سامنے رکھتے ہوئے لڑکیوں کی تعلیم اور عصری تعلیم کی طرف بھی توجہ دی ہے، اور اس جہت سے بھی اس کی خدمات نمایاں ہیں، حضرت مولانا عبدالحنان صاحبؒ اس علاقہ کے قدیم علماء میں تھے، زندگی کا بیشتر حصہ گجرات میں درس حدیث میں گزارا، اپنے زمانہ کے اکابر اہل علم بالخصوص حضرت مولانا قاری محمد صدیق باندویؒ سے عقیدت مندانہ اور نیازمندانہ تعلق تھا، علاقہ کے بعض قدیم مدارس جب مردہ ہوگئے تو مولانا نے اس خطہ میں دینی تعلیم کا ایک نیا چمن لگانے کا عزم وارادہ کیا، اور کم وقت میں اس کو ایک گلشن سدا بہار بنادیا، ادارہ کے موجودہ ذمہ دار مہتمم جناب مولانا حفظ الرحمن صاحب اور ادارہ کے سرپرست کے حسن انتظام اور توجہ وانصرام کی وجہ سے اس وقت یہ ادارہ بہار کے مرکزی اداروں میں سے ایک ہے، یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اکیڈمی کا تیسرا فقہی سیمینار جو بڑے ہی حسن انتظام اور عظمت شان کے ساتھ دارالعلوم ماٹلی والا گجرات میں منعقد ہوا تھا، حضرت مولانا عبدالحنان صاحب ہی اس کے محرک تھے، آج جب اس گلشن علمی میں یہ سیمینار منعقد ہورہا ہے، جس کو انھوں نے اپنے ہاتھوں سے لگایا ہے اور اپنے پسینے سے سیراب کیا ہے تو یقیناً ان کی روح کو اس سے سکون پہنچے گا اللہ تعالیٰ اُن کی بال بال مغفرت فرمائے۔

حضرات!

ادھر سالہا سال سے اکیڈمی کے سیمیناروں کا معمول رہا ہے کہ کسی اہم فکری اور قومی مسئلہ پر کلیدی خطبہ پیش کیا جاتا ہے، اور ملک بھر کے علماء راسخین اور فقہاء ربانیین کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بات رکھی جاتی ہے؛ تاکہ یہ پیغام پورے ملک تک پہنچ جائے اور اس کے دوررس اثرات مرتب ہوں، لوگ یہاں

سے جاتے ہوئے فقہ وفتاویٰ کی سوغات کے ساتھ ساتھ نظر وفکر کا تحفہ بھی لے کر جائیں، اس پس منظر میں اس وقت جو موضوع آپ بزرگوں کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں، وہ ہے، حکومت کی نئی تعلیمی پالیسی مجریہ ۲۰۲۰ء کے پس منظر میں دینی مدارس اور مسلمانوں کے زیر انتظام تعلیمی اداروں اور دیہات وقریہ جات کے بچوں کی دینی تعلیم وتربیت اور آئندہ نسلوں کے ایمان کا تحفظ۔

یہ بات محتاج اظہار نہیں کہ کسی بھی مذہب اور فکر وعقیدہ کے لئے تعلیم کی حیثیت شہ رگ کی ہے، اگر کسی قوم کو اس کے دین سے محروم کرنا ہو تو اس کے دینی تصورات سے اس قوم کا علمی رشتہ کاٹ دیا جائے، یہ چیز خود بخود اس قوم کو اپنے مذہب سے بے گانہ بنادے گی، اس کے لئے نہ پنجہ آزمائی کی ضرورت پڑے گی اور نہ معرکہ آرائی کی، یہ کسی قوم کو فکری اور مذہبی اعتبار سے قتل کرنے کا ایسا کامیاب اور بے ضرر نسخہ ہے کہ بقول شاعر:

دامن پہ کوئی چھینٹ، نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

ہندوستان میں اس وقت مسلمانوں کے ساتھ یہی طرز عمل اختیار کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، انگریز جب ہندوستان میں آئے تو انھوں نے یہی ناکام کوشش کی؛ چنانچہ لارڈ میکالے جب فورٹ ولیم کالج قائم کرنے کے بعد برطانیہ واپس گئے تو انھوں نے برطانوی دارالعوام میں اپنے اس منصوبہ کو ان الفاظ میں ظاہر کیا، ’’میں ہندوستان میں ایک ایسے ادارہ کی بنیاد ڈال کر آیا ہوں کہ اس کی وجہ سے ہندوستان میں رہنے والے لوگ رنگ ونسل کے اعتبار سے تو ہندوستانی رہیں گے؛ لیکن اپنی فکر اور ذہن ودماغ کے اعتبار سے انگریز بن جائیں گے‘‘۔

۱۸۱۳ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے ایک بل پاس کیا کہ ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کے لئے اگر پادری وہاں جانا چاہیں تو انہیں اجازت ہے، اس کے بعد ہی سے ہندوستان میں بڑی تعداد میں عیسائی پادری اور تبلیغی وفود کی آمد شروع ہوئی، ۱۹۰۰ء تک ہندوستان میں عیسائیوں کے ۴۲ رمشن اپنا قدم جما چکے تھے، ’’پادری ای اینڈ مینڈ‘‘ نے برسر عام دعوت دی تھی کہ اب تمام ہندوستان میں ایک عمل داری ہوگئی، تار برقی سے سب جگہ کی خبر ایک ہوگئی، ریلوے، سڑک سے سب جگہ کی آمدورفت ایک ہوگئی، مذہب بھی ایک چاہئے؛ اس لئے مناسب ہے کہ تم لوگ بھی عیسائی ایک مذہب ہو جاؤ‘‘ (سیرت مولانا محمد علی مونگیریؒ:۱۴۱) انگریزوں کی کوشش تھی کہ ایسا نظام تعلیم مروج ہو، جو پادریوں کے لئے ان کی تبلیغی کوششوں میں معاون ومددگار ثابت ہو؛ تاکہ ہندوستان میں بڑے پیمانہ پر لوگ عیسائیت کو قبول کرلیں، سر چارلس ٹریویلین آئی سی ایس جو برطانوی

کونسل کے ممبر تھے، نے ایک موقع پر ان خیالات کا اظہار کیا:

میرا یقین ہے کہ جس طرح ہمارے بزرگ کل کے کل ایک ساتھ عیسائی ہو گئے تھے، اسی طرح یہاں بھی سب ایک ساتھ عیسائی ہو جائیں گے، ملک میں مذہب عیسوی کی تعلیم بلا واسطہ کتابوں، اخباروں اور یورپینیوں سے بات چیت وغیرہ کے ذریعہ نفوذ کرے گی، حتیٰ کہ عیسوی علوم تمام سوسائٹی میں اثر کر جائیں گے، تب ہزاروں کی تعداد میں عیسائی ہوا کریں گے'' (تاریخ التعلیم، از سید محمود: ۶۹)

نتیجہ یہ تھا کہ گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ عیسائی پادری اور مناد مسلمانوں اور ہندوؤں کو دعوت ارتداد وتبدیلی مذہب دیتے تھے، سر سید احمد خان مرحوم بھی اپنی حد اعتدال سے بڑھی ہوئی رواداری اور حکومت برطانیہ کے حق میں نرم روی کے باوجود یہ کیفیت برداشت نہ ہو سکی، انھوں نے اپنے رسالہ بغاوت ہند میں اس کیفیت پر وضاحت سے روشنی ڈالی ہے، ان حالات میں اس فتنہ کے مقابلہ کے لئے وہی لوگ اُٹھے، جو دینی مدارس سے متعلق یا ان کے پروردہ تھے، انھوں نے شہر سے دیہات تک گلی کوچوں میں جا کر مسلمانوں کو اس فتنہ سے باخبر کیا، عیسائی مشنریز سے مناظرے کئے اور مسلمانوں کو ان کے دام ہم رنگ زمین سے بچایا، اس سلسلہ میں حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ، حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ وغیرہ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

جو کام برطانوی عہد میں انگریزوں نے کیا، موجودہ دور میں خاص کر ۲۰۱۴ء کے بعد مسلمانوں کے خلاف اسی مہم کو زیادہ قوت اور اعلان واظہار کے ساتھ سنگھ پریوار کے لوگ کر رہے ہیں؛ کیوں کہ نفرت اور اقلیت دشمنی ان کا بنیادی ایجنڈا ہے، صورت حال یہ ہے کہ سنگھ کے ودیا بھارتی اسکولوں کی تعداد اس وقت تیرہ ہزار ہے، جن میں ۴۷ ر ہزار اساتذہ اور ساڑھے سترہ لاکھ طلبہ ہیں، یہ سرسوتی اور شیشو مندر کے علاوہ ہیں، سنگھ پریوار نے ۱۹۹۳ء میں پروسینک سیوا پریشد قائم کی ہے، جس میں سابق فوجیوں کے ذریعہ ساتویں سے نویں کلاس تک کے طلبہ کو میلیٹری ٹریننگ دی جاتی ہے، اسی طرح تین رہائشی اسکول اس وقت ناگپور اور مہاراشٹر میں چل رہے ہیں اور نینی تال کا اسکول ان کے علاوہ ہے، ان کو جو تاریخ پڑھائی جاتی ہے، وہ مسلمانوں سے نفرت پر مبنی ہے، عجب بات ہے کہ حکومت کو سنگھ پریوار کے اداروں سے تو دہشت گردی اور تشدد کی بو نہیں آتی؛ لیکن مدارس اسلامیہ جو امن وآشتی کا گہوارہ ہیں، ان سے تشدد کی بو آتی ہے۔

نئی قومی تعلیمی پالیسی ۲۰۲۰ء سنگھ پریوار کی سوچ کا مکمل طور پر عکاس ہے، ۲۰۱۴ء میں جب این ڈی

اے کی حکومت اقتدار میں آئی، اسی وقت نئی تعلیمی پالیسی کے لئے ای ایس............. کی صدارت میں کمیٹی قائم کی گئی، مئی ۲۰۱۶ء میں کمیٹی نے رپورٹ دی؛ لیکن غالباً یہ رپورٹ حکومت کے ناپاک عزائم سے مکمل طور پر ہم آہنگ نہیں تھی؛ اس لئے دوبارہ ڈاکٹر.........رنجن کی سرپرستی میں ۲۰۱۷ء میں دوسری کمیٹی قائم ہوئی، جس نے ۳۱؍مئی ۲۰۱۹ء کو ۴۶۸؍صفحات پر مشتمل اپنی رپورٹ پیش کردی، قاعدہ کے مطابق رپورٹ کو پارلیمنٹ میں پیش ہونا چاہئے تھا، اور اس پر بحث ہونی چاہئے تھی؛ لیکن ایسا نہیں ہوا، مرکزی کابینہ نے پارلیمنٹ میں مباحثہ کی روایت سے انحراف کرتے ہوئے ۱۹؍جولائی ۲۰۲۰ء کو نئی قومی تعلیمی پالیسی (National Educational Policy 2020) کو منظوری دی؛ چوں کہ پالیسی پر باضابطہ بحث نہیں کرائی گئی اور زیادہ تر ریاستوں میں عملی طور پر ابھی پالیسی پر نفاذ عمل میں نہیں آیا ہے؛ اس لئے اس کے فوائد ونقصانات لوگوں کی نظروں کے سامنے نہیں آئے ہیں، حکومت خود اپنی پیٹھ ٹھونک رہی ہے اور اس پالیسی کی تعریف کررہی ہے؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ پوری طرح خلاف واقعہ ہے، یہ پالیسی ملکی مفاد کے خلاف ہے، اور ملک کے سیکولرزم کے لئے تباہ کن ہے، یہ ہندوستان کے سیکولر ڈھانچے سے کس قدر مطابقت رکھتا ہے، اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے، اس پالیسی کا اہم موضوع بھارتیہ کرن ہے، اور ان حضرات کے نزدیک بھارت سے مراد ملک کی محض ایک چھوٹی سی آبادی ہے، جو قدیم ہندو فلسفہ پر یقین رکھتی ہے، پالیسی میں بظاہر خوشنما الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، جیسے بھارتی علوم (Indian Knowledge) بھارتی اقدار (Indian Values) بھارتی تہذیب وتمدن (Indian Culture) بھارتی تاریخ (Indian History) مادری زبان میں تعلیم وغیرہ؛ لیکن ان مبہم تعبیرات کے مفہوم کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ وہ ہندو رنگ میں رنگ جائے، بھارت کی تاریخ کے عنوان سے قدیم ہندو دَور کا ذکر ہے، جس کی کوئی مستند تاریخ موجود نہیں ہے، ہندو مذہب کی دیو مالائی کہانیوں کو نصاب کا حصہ بنایا جارہا ہے، پورے مسلم عہد کی تاریخ کو ملک کی تاریخ سے باہر کردیا گیا ہے، بھارتی اقدار کے نام پر ہندو روایات کو اسکولی تعلیم کا حصہ بنایا جارہا ہے، بعض ریاستیں جہاں نئی تعلیمی پالیسی کو نافذ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، وہاں وید اور گیتا کے مختلف مضامین کتاب کا حصہ بنائے جارہے ہیں، کہا تو یہی گیا ہے کہ مادری زبان میں تعلیم کو فروغ دیا جائے گا؛ لیکن ایک سوال کے جواب میں وزیر تعلیم نے صرف آٹھ زبانوں کا ذکر کیا اور اس میں اردو زبان کا ذکر نہیں ہے، جب کہ اردو زبان ساتویں نمبر پر آتی ہے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اردو زبان کے بارے میں حکومت کی نیت کیا ہے، پالیسی میں کہا گیا ہے کہ پری پرائمری میں کھیل کود اور مختلف

سرگرمیوں کا نصاب بنایا گیا ہے، بظاہر یہ نصاب مشرکانہ نغموں، ڈانس اور بھجن پر مشتمل ہوگا، پالیسی میں غیر ملکی زبانوں کا بھی ذکر ہے، ان میں بعض زبانیں ایسی ہیں جن کو شاذ و نادر ہی ہندوستان میں جانا اور سمجھا جاتا ہے؛ لیکن عربی زبان کو اس میں جگہ نہیں دی گئی ہے، جب کہ معلوم ہے کہ عرب ممالک سے بڑے پیمانہ پر ہندوستان کے بسنے والوں کا روزگار وابستہ ہے۔

غرض کہ اگر نئی تعلیمی پالیسی کا جائزہ لیا جائے تو دو تین نکات واضح طور پر سامنے آتے ہیں، ایک مشرکانہ افکار وروایات اور رسوم ورواج کو اسکول کی تعلیمی نظام کا حصہ بنانا، دوسرے: برہمنی فکر کو بہت چالاکی کے ساتھ آگے بڑھانا، تیسرے: مسلمانوں کی تاریخ اور ان کی زبان کو نظر انداز کرنا، یہ ساری باتیں ملک کے جمہوری اور سیکولر قدروں کے خلاف ہے، اور مسلمانوں کے لئے اپنی اگلی نسلوں کے ایمان کی حفاظت کو متأثر کرنے والی ہیں۔

نئی تعلیمی پالیسی کے تحت دو پہلوؤں سے بچوں کے ذہنوں کو بگاڑنے اور ان کو شرک سے مانوس کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، ایک تو ہندو دیومالائی کہانیوں کو مسلمہ حقیقت کے طور پر کمسن بچوں کی نصابی کتابوں میں شامل کیا جارہا ہے، گیتا اور ویدوں کے مختلف حصے نصاب کا حصہ بنائے جارہے ہیں، پہلے نصاب میں دیگر مذاہب کی شخصیتوں کا بھی ذکر ہوتا تھا، اب اس کو بھی ختم کر دیا گیا ہے، توہم پرستی پر مبنی ہندو تاریخ کو حقیقی واقعات کے انداز پر پڑھانے کی کوشش کی جارہی ہے، اور مضحکہ خیز باتوں کو سائنسی حقائق کا رنگ دیا جارہا ہے، جیسے گنیش جی کی مورتی کو پلاسٹک سرجری کا شاہکار اور ہنومان جی کی ہندوستان سے سری لنکا آمد کو فضائی سائنس کی دریافت کا عنوان دیا جارہا ہے، گائے کے پیشاب کے خود ساختہ طبی فوائد بیان کئے جارہے ہیں، اور اسی طرح کی بہت ساری حقیقت سے بعید مفروضے اور کہانیاں ہیں، جن کو ایک سچائی اور دریافت کے انداز پر پیش کیا جارہا ہے۔

اسکولوں میں مشرکانہ افکار واعمال کو داخل کرنے کا دوسرا راستہ تہذیبی اور ثقافتی پروگرام ہیں، بچوں سے سرسوتی وندنا کرائی جاتی ہے، جن کو تعلیم کی دیوی باور کیا جاتا ہے، لکشمی دیوی کو رزق کی دیوی سمجھا یا جاتا ہے، بچوں کو اس کی پوجا کی ترغیب دی جاتی ہے، اور دماغ میں یہ بات بٹھائی جاتی ہے کہ اگر یہ دیوی خوش رہی تو دولت حاصل ہوگی، درگا پوجا بھی اسکولوں میں اہتمام کے ساتھ کرائی جاتی ہے، اور ان کو طاقت اور شکتی کی دیوی قرار دیا جاتا ہے، قرآن نے بار بار اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات دونوں کی توحید پر زور دیا ہے اور شرک فی الذات کی طرح شرک فی الصفات سے بھی منع کیا ہے، اس ماحول میں اس کی اہمیت سمجھ میں آتی ہے، تعلیم

گاہوں میں مختلف ہندو تہواروں اور تقریبات کا انعقاد، ہر جگہ ہندو دیوی دیوتاؤں کی تصویریں، ان قدیم شکست خوردہ راجاؤں کی تصویریں کو نمایاں کرنا، جن کی مسلم قبائل سے جنگ رہی ہے، جیسے مہارانا پرتاپ، پرتھوی راج، شیوا جی مہاراج وغیرہ جیسے شکست خوردہ حکمرانوں اور سپہ سالاروں کی داستانیں بیان کی جاتی ہیں، ان سب کا مقصد ہندوآئیڈیالوجی کو بلند اور برتر بنا کر پیش کرنا ہے۔

اس کا ایک حصہ یہ ہے کہ تاریخ کے نصاب سے پورے مسلم دور کو باہر کر دیا گیا ہے، جیسے یورپ میں مسلمانوں کے غلبہ وعروج کے عہد کو ڈارک ایج (Dark Age) کا نام دیا گیا، اسی طرح سنگھ پریوار کے مؤرخین نے مسلمانوں کے طویل دور حکومت --- جو اصل میں اس خطہ کی تعمیر وترقی کا دور تھا-- کو گوشہ گمنامی میں دھکیلنے کی کوشش ہو رہی ہے۔

اس پس منظر میں یہ بات بہت ضروری ہے کہ:

(الف) مسلمان زیادہ سے زیادہ اپنے اسکول قائم کریں، جس کا ماحول اسلامی ہو، اور جس کی تعلیم مشنری اور سنگھی اسکولوں کے معیار پر ہو، خاص کر علماء، دینی مدارس اور مذہبی تنظیمیں اپنے زیر انتظام ایسی درسگاہیں قائم کریں، ان اداروں میں جہاں تک ممکن ہو، لڑکے اور لڑکیوں کی جداگانہ تعلیم کا انتظام ہو، دلکش مگر شریعت سے ہم آہنگ یونیفارم ہو۔

(ب) یہ بات ظاہر ہے کہ اتنے اسکولوں کا قیام جہاں مسلمان لڑکے اور لڑکیاں پڑھ سکیں، آسان نہیں ہے؛ اس لئے ہر ریاست کے علماء اور دینی ذمہ داروں کا فریضہ ہے کہ وہ عصری اور دینی علوم کے ماہرین سے ایک ایسی کلید تیار کرائیں جو سرکاری نصاب کی زہرافشانیوں کا علاج تجویز کرتی ہو، اس میں عقیدۂ توحید کو اچھی طرح سمجھایا جائے، وہیں بت پرستی کی نامعقولیت اور بے حقیقتی کو اچھی طرح واضح کیا جائے، یہ ایک متوازی معاون نصاب ہو، جو مسلمان بچوں اور بچیوں کو ہفتہ میں ایک دن پڑھایا جا سکے۔

(ج) مدارس اپنے احاطہ میں ایسے کوچنگ سینٹر قائم کریں، جہاں مسلمان بچوں کے لئے مفت یا بہت معمولی خرچ پر ٹیوشن کا انتظام ہو، ان کو امتحان کے لئے تیار کیا جائے، درجات کے طویل مرحلوں سے گزارے بغیر ان کو کوچنگ کے ذریعہ امتحان دلایا جائے۔

(د) مسلمانوں کے زیر انتظام عصری مدارس کی ایک بڑی ضرورت نصاب تعلیم میں ایسے مضامین کو شامل کرنا ہے، جو مسلمان طلبہ اور طالبات کو اسلام کے بارے میں واقفیت بھی فراہم کریں اور اُن کو

احساس کمتری میں مبتلا ہونے سے بچائیں محض چند دُعاؤں کا یاددلا دینا کافی نہیں؛ بلکہ توحید، شرک، رسالت، عبادات، معاشرتی زندگی اور معاملات کے بارے میں ان کو معلومات فراہم کی جائیں، سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اسلامی تاریخ کے بارے میں جو غلط فہمیاں پیدا کی جاتی ہیں، ان کے متعلق وہ حقائق سے آگاہ ہوں، ہندوستان کی حقیقی تاریخ کہ مسلمانوں نے اس ملک کو کیا کچھ دیا؟ پڑھائی جائے، بابر، غزنوی وغوری، حضرت اورنگ زیب عالمگیرؒ اور ٹیپو سلطان شہیدؒ وغیرہ مسلم حکمرانوں کے بارے میں جو پروپیگنڈے کئے جاتے ہیں، ان کی حقیقت سمجھائی جائے؛ تاکہ آج از سرِ نو تاریخ لکھنے کی جو کوشش کی جارہی ہے، اس کے زہر سے مسلم نوجوانوں کے ذہن کو محفوظ رکھا جاسکے، ان موضوعات پر بہت سی تحریریں موجود ہیں، اگر ضرورت پڑے تو اس نقطۂ نظر سے کچھ کتابیں مدون کی جائیں، یہ وقت کی نہایت اہم ضرورت ہے، جن جماعتوں میں بورڈ کا امتحان دینا ہوتا ہے، ان جماعتوں کو چھوڑ کر دوسری کلاسس میں ایسی کتابیں رکھی جائیں تو شاید اس میں کوئی دقت نہ ہو۔

(ہ) موجودہ حالات میں ایک اہم مسئلہ اردو زبان کی تعلیم کا بھی ہے، اس میں شبہ نہیں کہ اُردو واحد زبان ہے، جس کو مسلمانوں نے وجود بخشا ہے، اس زبان میں تقریباً ۷۵ رفیصد الفاظ عربی اور فارسی ہیں، خود قرآن مجید کے الفاظ بہ کثرت اس زبان میں داخل ہیں، اسلامی اصطلاحات اور محاورات جس قدر اُردو زبان میں پائے جاتے ہیں، عربی زبان کے بعد کوئی زبان نہیں، جو اسلامی تعبیرات سے اس قدر مالا مال ہو، ایک غیر مسلم بھی جب اُردو زبان میں لکھتا اور بولتا ہے، تو "ماشاء اللہ، الحمد للہ، اور سبحان اللہ وغیرہ الفاظ بھی بولنے اور لکھنے پڑتے ہیں۔

پھر اُردو زبان میں اسلامی علوم کا سرمایہ اتنی بڑی مقدار میں پایا جاتا ہے کہ سوائے عربی زبان کے کوئی زبان نہیں جو اتنی مال دار اور صاحب ثروت ہو، تفسیر، قرآن وحدیث کے ترجمے، مسنون حدیث کی شرحیں، فقہ اور فقہی کتابوں کے ترجمے، سیرت، اسلامی تاریخ، غرض تمام ہی اسلامی علوم پر اردو زبان میں ایک عظیم الشان کتب خانہ تیار ہو چکا ہے، ایک زمانہ میں عربی کے بعد سب سے زیادہ اسلامی لٹریچر فارسی زبان میں تھا؛ لیکن اب اُردو نے فارسی پر سبقت حاصل کر لی ہے۔

اگر ہمارے بچے (جو عربی اور فارسی زبان سے بھی واقف نہیں ہیں) اُردو زبان سے بھی نابلد رہ جائیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بہت ہی عظیم اسلامی سرمایہ سے محروم ہو جائیں گے، اسلامی لٹریچر سے ان کا رابطہ

کٹ کر رہ جائے گا، اور اپنے سلف صالحین اور بزرگوں سے اُن کا رشتہ منقطع ہو جائے گا، اسلام کے بارے میں یا تو ان کو کوئی واقفیت اور آگہی نہیں رہے گی، یا وہ اپنی معلومات کے لئے ان لوگوں کی تحریروں اور کتابوں پر انحصار کریں گے، جو حقیقت میں اسلام کے معاند ہیں اور جن سے اسلام کی صحیح تصویر پیش کرنے کی توقع نہیں کی جاسکتی؛ اس لئے مسلم انتظامیہ کے تحت چلنے والے اسکولوں میں اُردو زبان کی تعلیم وقت کی نہایت اہم ضرورت ہے، اور اس سے چشم پوشی برتنا آنے والی نسلوں سے محرومی کو گوارا کرنے کے مترادف ہے، یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ جو لوگ اُردو زبان کے تحفظ کی تحریک چلاتے ہیں، دین دار ہیں، دینی علوم سے وابستہ ہیں، اردو زبان کی روٹی کھاتے ہیں، اردو میں وعظ وتقریر اور شعر وسخن ان کا امتیاز ہے، خود ان کے بچے اُردو کو ''اچھوت'' سمجھتے ہیں؛ اس لئے ضرورت تو اس بات کی ہے کہ اردو ذریعہ تعلیم کے زیادہ سے زیادہ معیاری اسکول قائم کئے جائیں؛ لیکن اگر اپنے اندر اتنی جرأت نہ پاتے ہوں، تو خواہ ذریعہ تعلیم انگریزی ہو، ثانوی زبان ہی کی حیثیت سے کم سے کم اردو کو داخل نصاب کریں، اس کے لئے اچھے تربیت یافتہ اساتذہ رکھیں اور اس کو پوری اہمیت دیتے ہوئے پڑھائیں، یہ موجودہ حالات میں آئندہ نسلوں کو اسلام پر باقی رکھنے اور مسلمان بچوں کا اسلام سے رشتہ استوار رکھنے کے لئے نہایت ضروری ہے۔

(و) عصری درس گاہوں کے طلبہ کی اسلامی تربیت اور ذہن سازی میں دینی مدارس بھی اہم کردار کر سکتے ہیں، اگر دینی مدارس ابتدائی مرحلہ میں پہلی جماعت سے ساتویں جماعت تک سرکاری نصاب کے ساتھ اسلامیات اور قرآن مجید پڑھ لیں، دو پارے حفظ کر لیں، سیرت اور دینیات کی کچھ کتابیں پڑھ لیں، نیز اسلامی عقائد اور تاریخ پر بھی کوئی کتاب ان کی ذہنی استعداد کے مطابق پڑھا دی جائے اور تربیت کا اسلامی ماحول ان کو دیا جائے، تو یہ نہایت ہی مبارک اور نافع قدم ہوگا۔

یہ تو اُن بچوں اور بچیوں کے مسائل کا حل ہے جو پوری طرح عصری تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں؛ لیکن ہمارے دینی مدارس کو بھی حالات کو سامنے رکھتے ہوئے ایسی راہ نکالنی چاہئے کہ مدرسہ میں پڑھنے والے بچے عصری علوم سے ناآشنا نہ رہ جائیں، علماء کے اپنے عہد کے تقاضوں سے باخبر بنانے کے لئے مدارس کو اپنے نظام میں کچھ تبدیلیاں لانے کی بھی ضرورت ہے، اس میں سب سے اہم مسئلہ زبان کا ہے، انگریزی زبان اس وقت عالمی رابطہ کی زبان ہے، یہ زبان نہ صرف غیر مسلموں تک اسلام کی دعوت پہنچانے کے لئے ضروری ہے؛ بلکہ خود مسلمانوں کی نئی نسل بھی تیزی سے اُردو کی گرفت سے باہر ہوتی جارہی ہے؛ اس لئے ہمیں ایک طرف اردو زبان کی

ترویج کی کوشش کرنی چاہئے، اور دوسری طرف علماء کو انگریزی زبان سے آراستہ کرنا چاہئے، یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ آج اسلام کے خلاف جو کچھ لکھا جارہا ہے اور علمی وفکری جہت سے دین حق پر جو یلغار ہورہی ہے، وہ زیادہ تر اسی زبان میں ہے، اگر علماء اس زبان کے سمجھنے اور اسی میں اپنا مافی الضمیر ادا کرنے کے لائق نہ ہوسکے تو وہ اسلام کی حفاظت واشاعت کا فریضہ صحیح طور پر انجام نہیں دے سکتے، یہ ایک ایسی حقیقت ہے، جس کو نظر انداز کرنا چڑھتے سورج سے آنکھیں موندنے کے مترادف ہوگا، ایک صاحبِ علم نے لکھا ہے کہ انگریزی زبان کی ناواقفیت کی وجہ سے علماء اس صدی میں مقام احترام پر تو فائز ہوئے؛ لیکن مقام قیادت پر فائز نہیں ہوسکے، میرا خیال ہے کہ یہ بات بڑی حد تک درست ہے۔

زبان محض ایک ذریعۂ اظہار ہے، اس کا صحیح وغلط اور مناسب ونامناسب استعمال مفید یا مضر ہوا کرتا ہے، کوئی بھی زبان اسلام کی نگاہ میں بذات خود ناپسندیدہ نہیں؛ اس لئے انگریزی زبان پر دسترس آج وقت کی اہم ضرورت ہے، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے دیوبند کے ابتدائی نصاب تعلیم میں سنسکرت کو بھی داخل نصاب کیا تھا، یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ علماء نے کبھی انگریزی زبان کی مخالفت نہیں کی، سرسید احمد خان مرحوم کے بعض افکار جمہورِ اُمت کے خلاف تھے، اور وہ انگریزی زبان کے ساتھ ساتھ انگریزی تہذیب وثقافت کی طرف بھی جھکاؤ رکھتے تھے، علماء نے اس میلان ورجحان سے اختلاف کیا تھا، موجودہ حالت میں خاص طور پر انگریزی زبان کی ایک خاص اہمیت ہوگئی ہے، جس سے کسی بھی طرح صَرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا۔

انگریزی کے علاوہ معاشیات، سیاسیات کی مبادی، تاریخ، جغرافیہ اور حساب وغیرہ کے بارے میں بھی ضروری حد تک آگہی علماء کے لئے ضروری ہے؛ اس لئے کہ بہت سے شرعی مسائل اور دینی حقائق ان ہی مضامین سے متعلق ہیں۔

ان مضامین کے لئے جگہ نکالنے کی دوصورتیں ہیں، ایک صورت تو یہ ہے کہ موجودہ نظام تعلیم میں ششم عربی تک چھ کی بجائے سات یا آٹھ گھنٹیاں کردی جائیں اور یہ زائد گھنٹیاں ان مضامین کے لئے رکھی جائیں، اور اس کے لئے کچھ اور گنجائش پیدا کرنے کی غرض سے منطق اور فلسفہ کی قدیم کتابوں کو اصطلاحات کی شرح ووضاحت تک محدود کردیا جائے، جیسے: منطق میں مرقات، شرح تہذیب، قطبی اور سلم العلوم اکثر مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں، گویا چار سال یہ مضمون پڑھائے جاتے ہیں، اسی طرح قدیم فلسفہ میں ہدایۃ الحکمۃ، ہدیہ سعیدیہ اور میبذی کے اسباق ہوتے ہیں، ان تین کتابوں کے لئے دوسال میں ایک ایک گھنٹی دی جاتی ہے، اب

اگر منطق کے لئے دو گھنٹی اور قدیم فلسفہ کے لئے ایک گھنٹی پر اکتفاء کر دیا جائے تو مزید تین گھنٹیاں نکل آتی ہیں، اسی طرح عربی کی ابتدائی جماعتوں میں بعض اسباق جو روزانہ ہوا کرتے ہیں، اگر ہفتہ میں چار دن ہوں تب بھی کتاب پوری ہوسکتی ہے، اس طرح ہفتہ میں دو دن کا وقت خالی کیا جاسکتا ہے، اگر ہم اس طرح وقت نکالیں تو معمولی تبدیلی کے ساتھ ان ضروری مضامین کے لئے وقت فراہم ہوسکتا ہے۔

دوسری اور اس سے اعلیٰ صورت یہ ہے کہ میٹرک تک تعلیم ہر طالب علم کو دی جائے؛ البتہ اس میں شروع سے تین گھنٹیاں اسلامیات کے لئے لے لی جائیں اور میٹرک کے بعد جیسے پانچ سال میں انٹر اور گریجویشن ہوتا ہے، اسی طرح پانچ سال میں عالم کورس کو مکمل کیا جائے، اگر میٹرک تک عربی نحو وصرف، ادب، ضروری فقہی مسائل وغیرہ کی مبادیات طلبہ پڑھ چکے ہوں تو اس پانچ سال میں جو عربی واسلامی علوم ہی کے لئے مخصوص ہوں، بہ سہولت درسِ نظامی کی تکمیل کر سکتے ہیں، اور چوں کہ یہ پوری تعلیم مدرسہ کے ماحول میں ہوگی؛ اس لئے اسلامی خطوط پر اُن کے ذہن ومزاج کی نشوونما ہوتی رہے گی، مدارس کا موجودہ نصاب نوسالہ عالم کورس اور چار تا پانچ سالہ شعبۂ ابتدائی پر مشتمل ہے، گویا تیرہ چودہ سال کا عرصہ اس کورس کی تکمیل پر لگتا ہے، اور اگر میٹرک کے ساتھ عالم کورس ہو تو اس کی مدتِ تعلیم ۱۵؍سال ہو جائے گی، یعنی ۱۹؍۲۰؍سال کے عرصہ میں لڑکے میٹرک کرنے کے ساتھ ساتھ عالم کورس مکمل کر لیں گے، گویا یہ اسلامی علوم میں گریجویشن کرنے کے مماثل ہوگا، اب جو طلبہ باصلاحیت ہوں وہ تخصص اور تحقیق کے شعبوں میں پڑھ سکتے ہیں، یہ دوسری صورت زیادہ بہتر ہے اور اس طرح جدید وقدیم کے درمیان جو فاصلہ محسوس کیا جاتا ہے، اسے بہتر طریقہ پر پُر کیا جاسکے گا۔

نئی نسلوں کو ایمان ودین پر باقی رکھنے کے لئے مدارس اور اسکولوں سے بڑھ کر مکاتب کا کردار ہے، افسوس کہ اس جہت سے دیہاتوں کے حالات بہت خراب ہیں، اس وقت صورت حال یہ ہے کہ علماء کی ساری تعلیمی اور دعوتی سرگرمیاں شہروں تک محدود ہو کر رہ گئی ہیں، شہر میں نہ صرف یہ کہ ہمارے دینی تعلیمی ادارے کام کر رہے ہیں؛ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ بعض مقامات پر زائد از ضرورت ادارے قائم ہو رہے ہیں، چھوٹے چھوٹے محلوں میں ایک سے زیادہ درسگاہیں قائم ہیں، وہاں طلبہ کی تعداد اتنی کم ہے کہ ایک ادارہ ان کے لئے کافی تھا، پھر اُن اداروں میں باہم کمرشیل اداروں کی طرح رقابت اور منافست کی کیفیت بھی ہے، بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کمیٹی میں اختلاف ہوگیا، ایک گروہ مدرسہ پر قابض ہوگیا، دوسرے گروہ نے قریب ہی دوسرا مدرسہ کھول لیا، گویا ادارے کسی ضرورت یا خدمت کی کسی نئی جہت کے لئے قائم کرنے کے بجائے محض

مقابلہ اور تفاخر کے جذبہ سے بھی قائم کئے جارہے ہیں، یہ کس قدر افسوس ناک بات ہے کہ ایک دینی کام دینی جذبہ سے خالی ہوکر انجام دیا جائے!

اس کے برخلاف دیہاتوں کا حال دیکھئے، بہت سے دیہات ایسے ہیں، جہاں کوئی نماز پڑھانے والا میسر نہیں اور بہت سی لاشیں بغیر نماز کے دفن کردی جاتی ہیں، کہیں قادیانی حملہ زن ہیں، کہیں ہندوفرقہ پرست تنظیمیں مسلمانوں کو مرتد کرنے پر کمربستہ ہیں، کہیں عیسائی مشنریز ایمان پر ڈاکہ ڈال رہی ہیں، جہالت کا حال یہ ہے کہ محرم رشتوں کا پاس ولحاظ بھی اُٹھ چکا ہے، ہندورسم ورواج سے متأثر ہوکر ماموں بھانجی میں نکاح ہوتا ہے، اور چچازاد بھائی سے نکاح نہیں ہوتا، مسلمان طرح طرح کی اخلاقی اور سماجی برائیوں میں مبتلا ہیں، اور سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص تک نہیں پڑھ سکتے؛ بلکہ کتنے ہی لوگ ہیں، جو کلمۂ طیبہ اور کلمۂ شہادت سے بھی محروم ہیں، آخر اُن ناواقف مسلمانوں کی اصلاح وہدایت کی ذمہ داری کن پر ہے، کیا علماء اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو سکتے ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ دیہاتوں میں مکاتب کے قیام کی ضرورت ہے، ان مکاتب میں چھوٹے بچوں کی تعلیم بھی ہو اور تعلیم بالغان کا بھی انتظام ہو، جس کے ذریعہ ضروریات دین سے لوگ واقف ہوجائیں، سب سے اہم مسئلہ ان دیہاتوں میں کام کرنے والے لوگوں کا ہے، اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ہمارے فضلاء شہر کی رونقوں کو چھوڑ کر دیہاتوں میں جانے اور کام کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے، یہاں تک کہ جو لوگ دیہاتوں میں پیدا ہوئے اور دیہات کے ماحول میں ان کی نشوونما ہوئی، وہ بھی شہر کی آب وتاب پر اس قدر ریجھ جاتے ہیں کہ دیہات کی طرف واپس جانے کو تیار نہیں ہوتے، یہ نہایت ہی افسوس ناک صورتِ حال ہے، مقام حیاء ہے کہ عیسائی مشنریز تو یورپ اور امریکہ سے آکر ہندوستان کے پسماندہ ترین دیہاتوں میں کام کریں اور عیسائیت کو پھیلانے میں اپنی پوری قوت صرف کردیں، اس کا نتیجہ آپ آندھرا اور بعض اور علاقوں کے دیہاتوں میں جا کر دیکھ سکتے ہیں، جہاں جگہ جگہ نوتعمیر شدہ چرچ آپ کو نظر آئیں گے، قادیانی ختم نبوت کے باغی ہیں اور اسلام کو سخت نقصان پہنچانے کے درپے ہیں؛ لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ کشمیر اور پنجاب جیسے دور دراز علاقوں سے ان کے مبلغین آتے ہیں اور ایسے گاؤں میں کام کرتے ہیں، جہاں موٹر اور بس کے پہنچنے کے لئے راستے تک میسر نہیں ہیں؛ بلکہ بعض اوقات یہ گورے چٹے نوجوان دیہات کی کالی کلوٹی، اَن پڑھ اور غیر مہذب لڑکیوں سے نکاح بھی کر لیتے ہیں؛ تاکہ انہیں جائے پناہ میسر آجائے اور وہ اسے اپنے مشن کے لئے تیار کریں؛ لیکن ہمارے فضلاء جو

یقیناً حاملین حق ہیں اور جن کا مقصدِ زندگی ہی اسلام کی حفاظت واشاعت ہے، وہ ایسے مقامات پر جانے اور شہر وقصبات سے آگے قدم بڑھانے کے لئے تیار نہیں۔

مدارس عام درس گاہوں کی طرح محض درس گاہ نہیں؛ بلکہ حفاظت اسلام کی ایک زندہ تحریک ہے اور اگر یہ مدارس کسب معاش کے پیشوں میں سے ایک پیشہ نہیں؛ بلکہ یہ آخرت کی ''تجارت رابحہ'' ہیں، اگر ہم احیاء اسلام کی مساعی کا ایک حصہ ہیں اور اس کاروانِ عزیمت سے نسبت رکھتے ہیں، جس نے اس ملک میں دین کی بقاء وارتقاء کے لئے سر دھڑ کی بازی لگادی تھی، تو یہ ہمارے لئے ایک امتحان ہے کہ کیا ہم زندگی کی معمولی سہولتوں کی قربانی کو بھی دین اور اُمت کے لئے گوارا نہیں کر سکتے؟ کیا ہم ان اہل باطل سے بھی گئے گزرے ہیں، جو اپنے فاسد عقیدے کی سوغات لے کر سماج کو بے روح بنانا چاہتے ہیں! یہ وقت کا نہایت اہم مسئلہ ہے کہ فضلاء مدارس دیہاتوں میں کام کریں، وہاں تعلیمی ادارے قائم کرنے کو تیار ہوں اور اس کو اپنا فریضۂ منصبی سمجھیں۔

شرکاء گرامی:

آج جب کہ اسلامک فقہ اکیڈمی کا ۳۳/واں سالانہ اجلاس منعقد ہو رہا ہے، ہمیں فکری طور پر ان بزرگوں کی یاد آتی ہے، جن کا اکیڈمی کی بنا وتاسیس اور اس کی ترقی میں نمایاں حصہ رہا ہے، ظاہر ہے کہ اس میں پہلا نام حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ کا ہے، جنھوں نے اس گلشن علم کی بنیاد رکھی، اور دوسرے حضرات کو اس میں شریک کیا، اکیڈمی کو مختلف مراحل میں حضرت مولانا مفتی عبدالرحیم لاجپوریؒ، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، حضرت مولانا مفتی نظام الدین اعظمیؒ، حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ، حضرت مولانا محمد سالم قاسمیؒ، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ اور امیر شریعت حضرت مولانا سید نظام الدین صاحبؒ کی سرپرستی کا شرف حاصل رہا،، ان حضرات کی شفقتیں اور دعائیں اکیڈمی کے قافلہ کو آگے بڑھانے میں اپنا کردار ادا کرتی رہیں، اکیڈمی کے پہلے صدر حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحیؒ کی قیادت میں ہم لوگوں کو کافی عرصہ تک خدمت کرنے کا موقع ملا، اکیڈمی کے معزز سکریٹری محترم المقام مولانا امین عثمانیؒ کی خدمات بھی ناقابل فراموش ہے، اللہ تعالیٰ بال بال ان کی مغفرت فرمائے، حضرت مولانا محمد برہان الدین سنبھلیؒ، حضرت مولانا مفتی اشرف علی باقویؒ، حضرت مولانا قاضی عبدالاحد ازہریؒ، حضرت مولانا محمد رضوان القاسمیؒ سابق نائبین صدر کے علاوہ وہ شخصیتیں ہیں، جن کی رہنمائی اکیڈمی کے لئے بنیادی اہمیت کی حامل ہے، اس وقت اکیڈمی کے بیشتر اعلیٰ عہدہ داران صحت کی ناموافقت سے دو چار ہیں، محترم جناب ڈاکٹر منظور عالم صاحب، جن کا اکیڈمی کی بنا اور تاسیس

میں نمایاں حصہ رہا ہے،صدر عالی قدر حضرت مولانا محمد نعمت اللہ اعظمی ، رفیق گرامی حضرت مولانا عبید اللہ اسعدی اور معزز رکن مخدوم ومحترم حضرت مولانا مفتی احمد خانپوری آپ کی خصوصی دعاؤں کے مستحق ہیں۔

اللہ کا شکر ہے کہ اکیڈمی میں سارے کام اجتماعی کوششوں کے ذریعہ انجام پاتے ہیں،ٹرسٹ کے تمام ارکان کے مخلصانہ مشورے اس میں شامل حال ہوتے ہیں، بالخصوص سکریٹری برائے علمی اُمور حضرت مولانا عتیق احمد بستوی دامت برکاتہم اور اکیڈمی کے خازن محب گرامی حضرت مولانا مفتی احمد دیولوی مدظلہ کا انتظامی تعاون اور توجہات قدم قدم پر اکیڈمی کی شریک حال ہے، یہ بھی بہت اہم ہے کہ اکیڈمی کو بہترین رفقاء کی خدمات حاصل ہیں،اوراُن کی مخلصانہ کاوشوں ہی کے ذریعہ ادارہ کے سارے کام انجام پاتے ہیں، یہ سب ہمارے اورآپ سب کے شکریہ اور دُعاؤں کے حقدار ہیں،اس کے ساتھ ساتھ اکیڈمی کی خوش قسمتی ہے کہ اس کے قافلہ میں نئی صلاحیتوں کی شمولیت کا تسلسل ہے،جس کا اندازہ آپ کو اکیڈمی کی سالانہ رپورٹوں سے ہوسکتا ہے۔

اخیر میں دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اکیڈمی کی علمی کوششوں کو جاری وساری رکھے اور یہ کاروانِ علم وتحقیق حوصلہ وہمت کے ساتھ اپنا قدم بڑھاتا رہے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

○○○

مصنوعی ذہانت (اے آئی) سے متعلق چند شرعی احکام

مولانا شاہد علی قاسمی ❖

مصنوعی ذہانت کا استعمال

اے آئی یعنی مصنوعی ذہانت اس دور کی حیران کن ایجاد ہے، جس کی شروعات ہو چکی ہے، اگر یہ موبائل کی طرح عام ہو جائے تو طرز زندگی میں بہت کچھ بدلاؤ آئے گا، جس کے فوائد بھی بہت ہیں اور نقصانات بھی بہت، دنیا بھر کی معلومات کی فراہمی، تصنیف وتالیف میں آسانی، کم وقت میں زیادہ کام ممکن ہونا، قانونی صلاح ومشورہ لینا، معاشی سرگرمیوں اور طب وعلاج میں مدد، تدریس کا کام اور نت نئے کام وغیرہ، ان فوائد کے ساتھ نقصانات بھی بے شمار ہوں گے، کیونکہ اس کے ذریعہ تلبیس وتزویر کا بازار گرم ہوسکتا ہے، کسی کی کرادرکشی کی جاسکتی ہے، جھوٹ کو سچ باور کرانے کا ایسا انداز ہوگا کہ حقیقت تک رسائی مشکل ہو جائے گی، پھر افواہوں کا بازار بہت گرمایا جاسکتا ہے، جس کے نتائج بھیانک بھی ہوسکتے ہیں، لیکن کیا یہ سب چیزیں اس وقت نہیں ہو رہی ہیں؟ جواب یہ ہے کہ مذکورہ بالا امور خواہ فوائد والے ہوں یا نقصانات والے یہ سب ایک حد تک پائے جا رہے ہیں، ٹی وی، موبائل، اپلیکیشنز، انٹرنیٹ، لیپ ٹاپ، کمپیوٹر، ویب سائٹس وغیرہ کے مجموعے سے جو چیزیں سامنے آچکی ہیں اور آرہی ہیں ان میں وہ نمونہ موجود ہے جو مصنوعی ذہانت سے کیا جائے گا، ہاں اتنا ضرور ہے کہ مصنوعی ذہانت کا استعمال انقلابی پہلو کا حامل ہوگا، فقہی پہلو سے دیکھا جائے تو ہمیں یہ ضابطہ ملتا ہے کہ اشیاء میں اصل اباحت ہے، جب تک کہ اس کے خلاف دلیل نہ آجائے۔

في شرح المنار للمصنف: الأصل في الأشياء الإباحة عند بعض الحنفية و منهم الكرخي. (الاشباه و النظائر : 115، تيسرا

❖ استاذ: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد

قاعدہ، الیقین لا یزول بالشك)

اسی طرح یہ ضابطہ ہے کہ جس چیز میں دو مفسدہ جمع ہو جائے تو چھوٹے مفسدہ کا ارتکاب کیا جائے گا، تا کہ بڑے مفسدہ سے بچا جا سکے،

اذا تعارضت مفسدتان روعی أعظمهما ضررا بارتکاب أخفهما (الاشباہ و النظائر : 145، قاعدہ: الضرر یزال)

اسی حقیقت کو دوسرے الفاظ میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ:

لو کان أحدهما أعظم ضررا من الآخر، فإن الأشد یزال بالأخف.
(الاشباہ و النظائر : 143، قاعدہ: الضرر یزال)

ایک اور قاعدہ ہے کہ بہت سے کاموں کا حکم ان کے مقاصد کے اعتبار سے ہوتا ہے، جائز مقصد سے ہو تو وہ کام جائز ہوگا، ناجائز مقصد کے لئے ہو تو ممنوع ہوگا۔ چنانچہ الاشباہ والنظائر کا قاعدہ نمبر دو ہے:

الأمور بمقاصدها.

اس قاعدہ کے تحت متعدد جزئیات کو علامہ ابن نجیم رحمہ نے پیش کیا ہے،

بہ طور نمونہ اس قاعدہ کی ایک مثال تحریر ہے کہ انگور کا شیرہ ایک حلال اور پاکیزہ چیز ہے، اب اگر کوئی شیرہ کو تجارتی نقطۂ نظر سے بیچے تو بیچنا جائز ہے، اور اگر اس لئے بیچے تا کہ خریدار شراب بنائے تو بیچنا جائز نہیں ہے

ان بیع العصیر ممن یتخذہ خمرا ان قصد به التجارة فلا یحرم و ان قصد به لاجل التخمیر حرم ۔ (الاشباہ و النظائر : 53، قاعدہ نمبر دوم)

کسی شخص کا اپنا گھر دوسرے کو کرایہ پر دینا جائز ہے، اب اگر کرایہ دار غیر مسلم اس میں اصلاتو رہائش رکھے، لیکن تبعا پوجا بھی کرلیا کرے تو ایسے شخص کو مکان کرایہ پر دینا جائز ہے، کیونکہ پوجا کرایہ دار کا ذاتی فعل ہے، پوجا کرنے کی وجہ سے گھر کرایہ پر دینا ناجائز نہیں ہوگا، بلکہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک غیر مسلم پوجا پاٹ ہی کے لئے مسلم سے مکان کرایہ پر لے تو مسلمان کا اسے کرایہ پر دینا جائز ہے۔ پوجا پاٹ کرنا حرام ضرور ہے، لیکن یہ کرایہ دار کا عمل ہے۔ علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

(قَوْلُهُ وَجَازَ إجَارَةُ بَيْتٍ إلَخْ) هَذَا عِنْدَهُ أَيْضًا لِأَنَّ الْإِجَارَةَ عَلَى

مَنْفَعَةِ الْبَيْتِ، وَلِهَذَا يَجِبُ الْأَجْرُ بِمُجَرَّدِ التَّسْلِيمِ، وَلَا مَعْصِيَةَ فِيهِ وَإِنَّمَا الْمَعْصِيَةُ بِفِعْلِ الْمُسْتَأْجِرِ وَهُوَ مُخْتَارٌ فَيَنْقَطِعُ نِسْبِيَّتُهُ عَنْهُ، فَصَارَ كَبَيْعِ الْجَارِيَةِ مِمَّنْ لَا يَسْتَبْرِئُهَا أَوْ يَأْتِيهَا مِنْ دُبُرٍ وَبَيْعِ الْغُلَامِ مِنْ لُوطِيٍّ وَالدَّلِيلُ عَلَيْهِ أَنَّهُ لَوْ آجَرَهُ لِلسُّكْنَى جَازَ وَهُوَ لَا بُدَّ لَهُ مِنْ عِبَادَتِهِ فِيهِ اهـ زَيْلَعِيٌّ وَعَيْنِيٌّ وَمِثْلُهُ فِي النِّهَايَةِ وَالْكِفَايَةِ، قَالَ فِي الْمِنَحِ: وَهُوَ صَرِيحٌ فِي جَوَازِ بَيْعِ الْغُلَامِ مِنْ اللُّوطِيِّ، وَالْمَنْقُولُ فِي كَثِيرٍ مِنْ الْفَتَاوَى أَنَّهُ يُكْرَهُ وَهُوَ الَّذِي عَوَّلْنَا عَلَيْهِ فِي الْمُخْتَصَرِ اهـ.(رد المحتار مع الدر 392/6 ، كتاب الحظر و الاباحة)

یہی حکم مصنوعی ذہانت کے استعمال کا ہے، کہ اس کا استعمال جائز مقصد کے لئے ہوتو مصنوعی ذہانت سے فائدہ اٹھانا درست ہے، اور معصیت پر مبنی امر میں استعمال ہوتو ناجائز ہے، اس کی واضح مثال موبائل ہے، کہ اس کا استعمال جائز کام کے لئے کیا جائے تو یہ جائز ہے، ناجائز کام کے لئے استعمال ہوتو یہ استعمال ناجائز ہے، نفس موبائل کو ناجائز نہیں کہا جائے گا، اسی طرح مصنوعی ذہانت سے فائدہ اٹھانے کا حکم ہے۔یعنی غیر شرعی کاموں میں استعمال ناجائز ہے، اور شرعی کاموں میں جائز، ہاں، یہ ضرور ہے کہ عمومی انداز سے اسے جائز قرار نہیں دیا جائے گا، بلکہ کچھ حد بندیوں کے ساتھ گنجائش ہوگی۔

مصنوعی ذہانت کے استعمال کے اصول وضوابط

(الف)۔ تزویر وتلبیس والے عمل سے بچنا لازم ہوگا، تزویر وتلبیس سخت ناپسندیدہ عمل ہے، احادیث شریفہ میں اس پر وعیدیں وارد ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

عَنْ أَبِي الْحَمْرَاءِ، قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ بِجَنَبَاتِ رَجُلٍ عِنْدَهُ طَعَامٌ فِي وِعَاءٍ، فَأَدْخَلَ يَدَهُ فِيهِ، فَقَالَ: " لَعَلَّكَ غَشَشْتَ، مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا ". (سنن ابن ماجه، حديث نمبر: 2225)

علامات قیامت میں سے ایک علامت یہ ہے کہ سچا کو جھوٹا اور جھوٹا کو سچا کہا جائے گا، امانت اٹھالی جائے

گی،خیانت کا دور دورہ ہوگا۔

تزویر وتلبیس کی نت نئی شکلیں ممکن ہیں،اس کی تمام ممکنہ شکلوں سے بچنا لازم ہوگا، چنانچہ کسی شخص کی فرضی تصویر ڈال کر ان کہی بات اس کی طرف منسوب کرنا تلبیس وتزویر میں داخل ہوکر حرام ہوگا۔

(ب): فحش اور بے حیائی والے امور سے بچنا لازم ہوگا،جیسا کہ فی زمانہ موبائل کا استعمال بہ کثرت فحش و بے حیائی پر مبنی امور کے لیے ہورہا ہے،قرآن مجید میں اس پر سخت وعید وارد ہے،ارشاد ربانی ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَنْ تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾ [النور: 19]

(ج): اگر مصنوعی ذہانت کے استعمال کے لئے کچھ مناسب ملکی قوانین وضوابط ہوں تو ان کی پاسداری لازم ہوگی ۔ کیونکہ ہر ملک کا شہری ملکی قوانین کی پاسداری میں معاھد ہوتا ہے،صراحتا یا دلالتا وہ معاھدہ کرتا ہے کہ میں ملک کے قوانین کی رعایت کروں گا۔لہذا معاھدہ شکنی سے بچنا لازم ہوگا،بہ شرطیکہ قانون شرعی حکم کے خلاف نہ ہو۔

(د): مصنوعی ذہانت کا استعمال کرتے ہوئے کوئی ایسا عمل نہ کیا جائے جو فتنہ انگیزی کا باعث بنے۔جیسا کہ قرآن مجید میں کہا گیا:

﴿وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ﴾ [البقرة: 191]

مصنوعی ذہانت کا استعمال کرتے ہوئے فتنہ پھیلانا آسان ہوگا،غلط ویڈیو بنا کر،نقض امن پر مبنی پوسٹیں ڈال کر،وغیرہ۔

(ہ): مصنوعی ذہانت کے استعمال میں اتنا انہماک نہ ہو کہ حقوق وفرائض میں کوتاہی ہو۔

(و): مصنوعی ذہانت سے جو معلومات حاصل کی جائیں،ان کو مکمل سچ نہ سمجھا جائے، بلکہ اسے محتمل الصدق والکذب کا درجہ دیا جائے ، کیونکہ معلومات کے حصول کے لئے مصنوعی ذہانت کی حیثیت خبر مجہول یا خبر مستور کی ہوگی،ظاہر ہے کہ خبر مجہول ومستور کو استنادی حیثیت حاصل نہیں ہے،ہاں اگر دوسرے معتبر ذرائع یا قرائن سے صداقت کا یقین ہوجائے تو پھر یقین کرنا معتبر ہوگا۔

(ز): ایک اہم پہلو یہ ہے کہ حدود و قیود کی رعایت کے ساتھ مصنوعی ذہانت کے استعمال کی بات اسی وقت ہے جب کہ اس کی افادیت غالب ہو، یعنی استعمال کرنے والا مضرت سے بچنا چاہے، اور نافع پہلو سے فائدہ اٹھانا چاہے تو ایسا ممکن ہو سکے، لیکن اگر آئندہ جب مصنوعی ذہانت کا استعمال عام ہو جائے اور اس کا نتیجہ دین یا دنیا کی تباہی یا اخلاقی اقدار کی پامالی یا شرم وحیاء کے رخصت ہو جانے وغیرہ کا ہو تو سد ذریعہ کے طور پر حکم جواز سے نکل کر عدم جواز کا ہوگا، جیسا کہ ہتھیار بیچنا فی نفسہ جائز ہے، لیکن بغاوت کے زمانہ میں باغیوں کے ہاتھ ہتھیار فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔ صاحب ھدایہ فرماتے ہیں:

ويكره بيع السلاح من أهل الفتنة وفی عساكرهم لأنه إعانة على المعصية وليس ببيعه بالكوفة من أهل الكوفة ومن لم يعرفه من أهل الفتنة بأس لأن الغلبة من الأمصار لأهل الصلاح وإنما يكره بيع نفس السلاح لا بيع مالا يقاتل به إلا بصنعة ألا ترى أنه يكره بيع المعازف ولا يكره بيع الخشب وعلى هذا الخمر مع العنب والله أعلم بالصواب.(هداية 414/2)

چیٹ جی پی ٹی اور تصنیف

ہر نئی تالیف تصنیف ہے جس میں فنون، یا ادبی امور یا علوم کو جمع کیا گیا ہو۔

كل تأليف مبتكر فی الآداب أو الفنون أو العلوم. (معجم المعانی الجامع)

اگر کوئی مصنوعی ذہانت (چیٹ جی پی ٹی) کی مدد سے مرتب مضامین یا منتخب سوالات کے جوابات اور لکھی ہوئی کتاب کی طرح تحریر حاصل کر لے اور اپنے نام سے طباعت کرا لے اور حق تصنیف اپنے پاس رکھے، تو ایسا کرنا درست ہے یا نہیں؟ تو اس سلسلہ میں یہ ملحوظ رہے کہ چیٹ جی پی ٹی علمی مواد حاصل کرنے کی ترقی یافتہ شکل ہے، کوئی تصنیفی کام کرنے والا مثلا لائبریری میں موجود مختلف کتابوں کو اکٹھا کرتا ہے، پھر مطالعہ کر کے مطلوبہ مواد نقل کرتا ہے، چیٹ جی پی ٹی نے اس کام کو آسان کر دیا کہ وہ خود دنیا بھر کے موجود ڈیجیٹل مواد میں سے چھانٹ کر سوال کے مطابق جواب حاضر کر دیتا ہے، گویا اس نے جمع مواد کا کام آسان کر دیا، لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ ہمیشہ صحیح جواب دیتا ہے، بسا اوقات غلط جواب بھی دیتا ہے، تعبیرات میں بھی بسا اوقات واضح غلطی

رہتی ہے، اس لئے اس کے جوابات میں تنقیح وتہذیب کرنی پڑتی ہے، چیٹ جی پی ٹی کی موجودہ صورت حال اس لائق نہیں ہے کہ بغیر تنقیح وتہذیب کے اس کی تحریر قابل اشاعت ہوجائے، بلکہ اچھی خاصی محنت کے بعد ہی وہ تحریر قابل اشاعت ہوسکتی ہے، اس لئے معقول محنت کے بعد تحریر کو قابل اشاعت بنانا اور اسے اپنی طرف منسوب کرنا اور حق تصنیف محفوظ رکھنا درست ہے، بالفرض چیٹ جی پی ٹی کے تحریری جوابات بہت مرتب ہوں اور قابل اشاعت بھی، پھر بھی اسے اپنی طرف منسوب کرنا اور حق تصنیف محفوظ رکھنا درست ہوگا کیونکہ مختلف سوالات کرنا اور جوابات حاصل کرنا جمع مواد کی ترقی یافتہ شکل ہے، اب جس نے اس ترقی یافتہ شکل سے فائدہ اٹھایا، اور سوالات کر کے جوابات کو مرتب کیا اور اس کو قابل اشاعت بنانے کے لئے محنت کی، اسے بجا طور پر اپنی طرف اسے منسوب کرنے کا حق ہے، اور وہ حق تصنیف بھی محفوظ رکھ سکتا ہے، یہ پہلو بھی اہم ہے کہ چیٹ جی پی ٹی معلومات تو فراہم کرتا ہے، لیکن یہ معلومات مراجع و مآخذ سے عاری ہوتی ہیں، اس لئے صرف چیٹ جی پی ٹی کی تحریر غیر محقق کے دائرہ میں آئے گی، جس طرح ہمارے بعض فقہاء کی کچھ کتب غیر مستند سمجھی جاتی ہیں، جیسے بہ قول علامہ شامی قہستانی کی کتاب جامع الرموز ہے، مصنف کے احوال معلوم نہ ہونے کی وجہ سے یہ کتاب کتب غریبہ کی صف میں آ گئی، (شرح عقود رسم المفتی:12)

اسی طرح چیٹ جی پی ٹی کی تحریر کا حال ہوگا، تاہم کوئی اس طرح کی تحریر حاصل کر ہی لے اور مآخذ و مراجع سے مزین نہ کرے اور اس کی طباعت کرے تو اس کو چاہیے کہ شروع کتاب میں چیٹ جی پی ٹی کا حوالہ دے دے، تاکہ قارئین اس کتاب کے معتبر یا غیر معتبر ہونے کو سمجھ لے۔

اذان کے لئے مصنوعی ذہانت کا استعمال

اذان محض عام آواز نہیں کہ کسی آلہ سے آواز بلند کر دی جائے، کلمات اذان کو کسی آلہ میں ضبط کر کے آواز سے سنا دیا جائے، بلکہ یہ ایک عبادت ہے، اور عبادت کے وجود کے لئے اہلیت ضروری ہے، اور اہلیت کے لئے جہاں مختلف شرطیں ہیں وہیں ایک شرط یہ ہے کہ وہ صاحب تمیز ہو، اسی لئے اس بچہ کی اذان معتبر نہیں ہے جو سن شعور کو نہ پہنچا ہو، علامہ ابن نجیم مصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

، وَأَمَّا الْعَقْلُ فَيَنْبَغِي أَنْ يَكُونَ شَرْطَ صِحَّةٍ فَلَا يَصِحُّ أَذَانُ الصَّبِيِّ الَّذِي لَا يَعْقِلُ وَالْمَجْنُونِ وَالْمَعْتُوهِ أَصْلًا. وَأَمَّا الصَّبِيُّ الَّذِي يَعْقِلُ فَأَذَانُهُ صَحِيحٌ مِنْ غَيْرِ كَرَاهَةٍ فِي ظَاهِرِ الرِّوَايَةِ إلَّا أَنَّ أَذَانَ

الْبَالِغِ أَفْضَلُ، (البحر الرائق:279/1)

لہذا مصنوعی ذہانت کا استعمال اذان کے لئے کرنا غیر معتبر ہے۔

فون کی آواز شرعا معتبر نہیں

چونکہ مصنوعی ذہانت سے تلبیس وتزویر کوئی مشکل کام نہیں، عین ممکن ہے کہ کسی شخص کی مخصوص آواز میں ایسی بات پیش کی جائے جو اس نے نہ کہی ہو، اس لئے فون کی آواز ثبوت کے لئے ناکافی ہے، اگر معاملہ دار القضاء کا ہو تو یہاں احتیاط مزید کی ضرورت رہتی ہے، قاضی کا فیصلہ ٹھوس ثبوت وشواہد کی روشنی میں ہوتا ہے، دار القضاء میں تو بنیادی طور پر تحریر ودستاویز بھی ثبوت کے لئے ناکافی ہے، جب کہ فی زمانہ دستاویز کی بڑی اہمیت ہے، لیکن تزویر وتلبیس کے اندیشہ سے اسے غیر معتبر مانا گیا ہے، علامہ کاسانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وَلَا اعْتِمَادَ عَلَى الْخَطِّ وَالْخَتْمِ، لِأَنَّ الْخَطَّ يُشْبِهُ الْخَطَّ وَالْخَتْمُ يُشْبِهُ الْخَتْمَ وَيَجْرِي فِيهِ الِاحْتِيَالُ وَالتَّزْوِيرُ مَعَ مَا أَنَّ الْخَطَّ لِلتَّذَكُّرِ فَخَطٌّ لَا يُذَكِّرُ، وُجُودُهُ وَعَدَمُهُ بِمَنْزِلَةٍ وَاحِدَةٍ.(بدائع الصنائع 273/6)

البتہ یہ پہلو بھی اہم ہے کہ آواز میں ایڈیٹنگ ہوئی ہے یا نہیں؟ اسے اس میدان کے ماہرین سے جانا جاسکتا ہے، لہذا اگر کسی کی آواز کو اس پہلو سے جانچ لیا گیا ہو اور رپورٹ یہ ہو کہ یہ اسی آدمی کی آواز ہے تو ایک حد تک اس رپورٹ پر اعتماد کیا جاسکتا ہے، مکمل اعتماد نہیں، مکمل اعتماد اس لئے نہیں کہ بسا اوقات تحقیق میں بھی غلطی ہو جاتی ہے، اور ایک حد تک اعتماد کا مطلب یہ ہے کہ اس آواز کو قرینہ کے درجہ میں رکھا جائے گا، لہذا جن صورتوں میں قرینہ کافی ہوتا ہے، وہاں یہ آواز معتبر ہوگی، جیسے تعزیر کرنا کہ ایک حد تک شبہ والی دلیل بھی تعزیر کے لئے کافی ہوتی ہے، علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وَكَلَامُهُمْ هُنَا يَدُلُّ ظَاهِرًا عَلَى أَنَّ الْقَاضِيَ يُعَزِّرُ الْمُتَّهَمَ وَإِنْ لَمْ يَثْبُتْ عَلَيْهِ.(البحر الرائق:234/6)

اگر فون کی آواز کو چیک نہیں کیا گیا، لیکن دوسرے ذرائع سے اصلی آواز ہونا ثابت ہو جائے، جیسے شرعی شہادت موجود ہو یعنی دو عادل لوگوں نے فون پر بات کرتے ہوئے سنا ہو، اور وہ دونوں اس کی گواہی دیں تو یہ بولنے والے کے اقرار پر گواہی متصور ہوگی، اور اسی اعتبار سے احکام جاری ہوں گے، لیکن محض آواز کو اقرار کا درجہ حاصل نہیں ہوگا۔

کسی شخص سے منسوب ویڈیو یا آڈیو ریکارڈنگ شرعی ثبوت نہیں۔

اگر کسی شخص کی طرف کوئی ویڈیو یا آڈیو ریکارڈنگ منسوب ہوتو یہ شرعی ثبوت کے لئے ناکافی ہے، کیونکہ یہاں بھی تلبیس وتزویر کا اندیشہ ہے، بلکہ اس میں فون کی آواز سے بھی زیادہ شبہ ہے، کیونکہ لائیوفون کی آواز میں تلبیس کا امکان کم ہوتا ہے، جب کہ ریکارڈڈ آڈیواور ویڈیو میں تلبیس کے مواقع زیادہ ہوتے ہیں، اس لئے جوتفصیلات فون کی آواز کی پیش کی گئیں ہیں وہ تفصیلات یہاں بھی منطبق ہوں گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ محض آڈیواور ویڈیو ریکارڈ شرعی ثبوت کے لئے ناکافی ہے، البتہ اس سے استیناس کیا جائے گا، اوراسے قرینہ کے درجہ میں رکھا جائے گا، لیکن یہ قرینہ محض ہوگا، نہ کہ قرینہ قاطعہ، ہاں اگر تحقیق سے اس کے اصلی ہونے کا ثبوت مل جائے تو یہ قرینہ قاطعہ کے درجہ میں ہوگا۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اگر صاحب آواز کا اقرار موجود ہو یا معاملہ کے عینی گواہان موجود ہوں جو دار القضاء میں واقعہ کی شہادت دیں تو آڈیو یا ویڈیو کی حیثیت مزید تقویت کی ہوگی، البتہ فیصلہ تو اقرار یا شہادت کی بنیاد پر ہوگا۔

اگر ملازمین چیٹ جی پی ٹی سے مفوضہ کام کرلیں تو کیا انہیں ذمہ داری انجام دینے والا مانا جائے گا، اور کیا وہ معاوضہ کے مستحق ہوں گے؟

چیٹ جی پی ٹی جمع مواد کی ترقی یافتہ شکل ہے، اس سے ہفتوں کا کام چند گھنٹوں میں ہوسکتا ہے، لیکن اس سے حاصل ہونے والے علمی مواد کو استنادی حیثیت حاصل نہیں ہے، لہذا علمی وتحقیقی کام کرنے والے محض چیٹ جی پی ٹی کی مدد سے کام مکمل نہیں کرسکتے، جب تک کہ محنت مزید کرکے مآخذ ومراجع سے مزین نہ کیا جائے ، اور ممکنہ خطاؤں کو درست نہ کرلیا جائے، اس لئے راقم الحروف کا خیال ہے کہ علمی وتحقیقی کام میں چیٹ جی پی ٹی سے مدد لینا جمع مواد کی حد تک درست ہے، صرف اسی پر قناعت کرنا ذمہ داری اداء کرنے سے راہ فرار اختیار کرنے کی طرح ہے، کیونکہ یہ علمی وتحقیقی کام کے لیے ناکافی ہے، اگر صرف چیٹ جی پی ٹی کے ذریعہ ناقص کام کرلیا گیا تو دوصورتیں ہوسکتی ہیں، ایک یہ کہ کام انتہائی ناقص اور ناقابل قبول ہوتو کام کو رد کردینے اور اجرت نہ دینے کا حق ذمہ دار کو ہوگا، دوسری صورت یہ ہے کہ کام قابل قبول ہو، لیکن مقررہ معیار سے کم ہوتو کام کرنے والے کو اجرت مقررہ کے بجائے اجرت مثل ملے گی، علامہ کاسانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وَإِنْ كَانَ الْخِلَافُ فِي النُّقْصَانِ فَفِيهِ رِوَايَتَانِ: ذَكَرَ فِي الْأَصْلِ أَنَّ لَهُ أَنْ يَأْخُذَهُ وَيُعْطِيَهُ مِنْ الْأَجْرِ بِحِسَابِهِ، وَذَكَرَ فِي رِوَايَةٍ أُخْرَى أَنَّ عَلَيْهِ أَجْرَ الْمِثْلِ، وَجْهُ هَذِهِ الرِّوَايَةِ أَنَّهُ لَمَّا نَقَصَ فِي الْقَدْرِ فَقَدْ فَوَّتَ الْغَرَضَ الْمَطْلُوبَ مِنْ الثَّوْبِ فَصَارَ كَأَنَّهُ عَمِلَ بِحُكْمِ إجَارَةٍ فَاسِدَةٍ لَيْسَ فِيهَا أَجْرٌ مُسَمًّى.(بدائع الصنائع : 217/4)

جہاں تک ان کاموں کا تعلق ہے جو علم وتحقیق والے نہیں ہیں، جیسے امتحانی پرچے بنانا، سبق کی منصوبہ بندی، ٹائپنگ، رپورٹ کی تیاری، قانونی صلاح ومشورہ کی فراہمی اور اس جیسے کام، تو چیٹ جی پی ٹی کا استعمال ان کاموں کے لئے درست ہے، کیونکہ کام قبول کرنے والے کو حق ہے کہ وہ مفوضہ کام کو انتہائی سرعت سے کرلے، یا آہستہ آہستہ کرے، اب کام کرنے والے دو طرح کے ہو سکتے ہیں، ایک وہ جو معاوضہ پانے کے لئے کام مکمل کرنے کے پابند ہوں، وقت مقرر ہو، علامہ کاسانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وَلِلْأَجِيرِ أَنْ يَعْمَلَ بِنَفْسِهِ وَأُجَرَائِهِ إذَا لَمْ يُشْتَرَطْ عَلَيْهِ فِي الْعَقْدِ أَنْ يَعْمَلَ بِيَدِهِ؛ لِأَنَّ الْعَقْدَ وَقَعَ عَلَى الْعَمَلِ، وَالْإِنْسَانُ قَدْ يَعْمَلُ بِنَفْسِهِ وَقَدْ يَعْمَلُ بِغَيْرِهِ؛ وَلِأَنَّ عَمَلَ أُجَرَائِهِ يَقَعُ لَهُ فَيَصِيرُ كَأَنَّهُ عَمِلَ بِنَفْسِهِ، إلَّا إذَا شَرَطَ عَلَيْهِ عَمَلَهُ بِنَفْسِهِ؛ لِأَنَّ الْعَقْدَ وَقَعَ عَلَى عَمَلٍ مِنْ شَخْصٍ مُعَيَّنٍ، وَالتَّعْيِينُ مُفِيدٌ؛ لِأَنَّ الْعُمَّالَ مُتَفَاوِتُونَ فِي الْعَمَلِ فَيَتَعَيَّنُ فَلَا يَجُوزُ تَسْلِيمُهَا مِنْ شَخْصٍ آخَرَ مِنْ غَيْرِ رِضَا الْمُسْتَأْجِرِ.(بدائع الصنائع 208/4)

دوسرے وہ ملازم ہیں جو مقررہ وقت میں حاضر رہ کر کام کرنے کے پابند ہوں، مثلاً مہینہ ہونے پر تنخواہ وصول کرتے ہوں، خواہ کام مکمل نہ ہوا ہو، تو اس دوسری شکل کے ملازمین چیٹ جی پی ٹی کا استعمال کریں یا کسی اور ذریعہ سے کام جلد کرلیں، انہیں تو پورا وقت مقررہ ملازمت کی جگہ پر رہنا ہے، اور کام مکمل ہونے پر ذمہ دار کو بتلانا ہے، تاکہ ذمہ دار دوسرا کام حوالہ کرے، اور دوسرا کام فی الحال نہ ہو تو ذمہ دار کے حسب منشاء کام کا انتظار کرے۔ اور پہلی شکل والے کارکنان بھی مفوضہ کام چیٹ جی پی ٹی سے کر سکتے ہیں، کیونکہ کام جلد کرلینا اور ترقی یافتہ ذریعہ سے کرلینا یہ اس کا حق ہے، ہاں اتنا ضرور ہے کہ کام کا معیار وہ ہو جو ذمہ دار سے طے شدہ ہو، صاحب

ہدایہ فرماتے ہیں:

قال: والأجير الخاص الذی يستحق الأجرة بتسليم نفسه فی المدة وإن لم يعمل كمن استؤجر شهرا للخدمة أو لرعی الغنم وإنما سمی أجير وحد؛ لأنه لا يمكنه أن يعمل لغيره؛ لأن منافعه فی المدة صارت مستحقة له والأجر مقابل بالمنافع، ولهذا يبقی الأجر مستحقا، وإن نقض العمل.(هدايه: 243/3)

واضح ہو کہ تینوں شکلوں میں اگر ذمہ دار کی طرف سے چیٹ جی پی ٹی کے استعمال کی کسی معقول وجہ سے ممانعت ہو تو اجیر پر اس کی پاسداری لازم ہوگی۔

❍❍❍

امام ابو یوسفؒ پر محدثین کی جرح کا تنقیدی جائزہ

مولانا فرقان پالن پوری[1]

امام ابو یوسفؒ جامع کمالات تھے، ان کی شخصیت میں متضاد اوصاف اس طرح یکجا ہو گئے تھے کہ اس پر یقین کرنا مشکل ہے، ایک جانب آپ فقہ، حدیث، تفسیر اور علوم اسلامیہ میں نمایاں ترین حیثیت رکھتے ہیں تو اسی کے ساتھ آپ اپنے وقت کی سب سے بڑی حکومت کے وزیر قانون اور چیف جسٹس ہیں، طلبہ کو فقہ وحدیث کا درس بھی دیتے ہیں، روزانہ فرائض کے ساتھ دوسو رکعت نفل بھی ادا فرماتے ہیں اور اس عبادت وزہد کے ساتھ وقت کی سب سے بڑی سلطنت کے ہم نشیں بھی ہے، ان سب کو دیکھ کر یہی کہنا پڑتا ہے:

ليس على الله بمستنكر
أن يجمع العالم في واحد

امام ابو یوسفؒ کے فقہی تراث پر خاصا کام ہوا ہے، یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جیسا اور جتنا ہونا چاہئے، اتنا کام ہوا ہے، لیکن پھر بھی جو کچھ ہوا ہے وہ خاصا اہم اور وقیع ہے، لیکن امام ابو یوسف محض فقیہ نہیں تھے؛ بلکہ مجتہد مطلق تھے، جو قرآن وحدیث سے اور مصادر اسلامیہ سے فقہی مسائل کا استنباط کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ آپ ایک عظیم اور جلیل القدر محدث ہیں، امام ابو یوسفؒ کی خدمات حدیث پر کام بہت کم ہوا ہے، جب کہ ضرورت اس بات کی تھی اور ہے کہ اس گوشے کو نمایاں اور واضح کیا جائے؛ بالخصوص علم حدیث میں ان پر جو جرح ہوئی ہے، اس کا جائزہ لے کر حقیقت پسندانہ تجزیے کی ضرورت ہے؛ تاکہ علم حدیث میں ان کے مقام ومرتبہ سے واقفیت ہو اور علم حدیث میں فقہاء احناف کے متعلق علمی دنیا میں جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، ان کا ازالہ ہو، محدثین کرام اور ناقدین رجال میں امام ابو یوسف کو ثقہ قرار دینے والوں کی تعداد زیادہ ہے؛ لیکن اس کے بالمقابل یہ بھی ایک حقیقت ہے اور اس کا اعتراف ہمیں کرنا چاہئے کہ امام ابو یوسفؒ پر بعض محدثین نے ان کی عدالت یا ان کے

❖ رفیق شعبہ تحقیق المعہد العالی الاسلامی، (حیدرآباد)

حافظہ کے اعتبار سے جرح کی ہے، لہذا ذیل کے بحث میں ہم ان ہی محدثین کرام کے الفاظ جرح کا تنقیدی جائزہ لیں گے اور دیکھیں گے کہ وہ حقیقت کے میزان پر کتنے پورے اترتے ہیں؟ وباللہ التوفیق!

امام جرح وتعدیل یحییٰ بن معینؒ

یحییٰ بن معینؒ سے منسوب کتب جرح وتعدیل میں امام ابو یوسفؒ کے بارے میں ایک عبارت ملتی ہے ''لا یکتب حدیثہ''(۱) اس قول کی سند صحیح ہے اور اس سند کے ایک راوی علان یعنی علی بن سلیمان (۲) کے بارے میں مشہور ناقد رجال ابن یونس نے نقد کرتے ہوئے کہا ہے:

وکانت فی خلقه زعارة(۳)

وہ تندخو اور ترش رو تھے۔

مطلب یہ کہ جیسا اخلاق ہونا چاہئے، ویسا نہیں ہے، یہ بظاہر جرح معلوم ہوتی ہے؛ لیکن علم تحقیق کی خوبصورتی اس کی غیر جانبداری اور بے لاگ ہونا ہے، لہذا ہم اس نقش قدم پر چلتے ہوئے یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ راوی پر جرح دو وجہ سے ہوسکتی ہے، یا تو اس کی عدالت میں کچھ کمی اور کلام ہو، یا پھر اس کے حفظ وضبط پر نقد ہو، یہاں ان دونوں سے ہٹ کر اخلاق کے بارے میں بات کی گئی ہے، لہذا یہ جرح قابل قبول نہیں ہے اور اس قول کی سند علی حالہ صحیح ہے، لیکن کسی قول کا صحیح ہونا اس کو لازم نہیں کرتا ہے کہ اس قول کا جو مفہوم لیا جا رہا ہے، وہ بھی صحیح ہو، اس قول کا کئی اعتبار سے جواب دیا جاسکتا ہے۔

اولاً: امام ابو یوسف کی توثیق ابن معین سے کئی طریقوں سے منقول ہے، خطیب بغدادی نے امام ابو یوسف کی توثیق کو ابن معین کے سات شاگردوں سے نقل کیا ہے اور صرف ان کے ایک شاگرد ابن ابی مریم سے یہ ''لا یکتب حدیثه'' کا جملہ منقول ہے، خطیب بغدادی نے بھی ابن ابی مریم کے اس جملہ کو ان کے شاگردوں کے قول کے خلاف تسلیم کیا ہے، حدیث میں بھی قاعدہ یہی ہے کہ وہ حدیث جس کے کئی طرق اور سندیں ہو، وہ ایک سند والی روایت پر جب کہ دونوں سند کی صحت وضعف کے اعتبار سے یکساں ہو، فوقیت رکھے گی، بعینہ یہی بات یہاں بھی کہی جاسکتی ہے کہ امام ابو یوسف کی توثیق ابن معین کے کئی شاگردوں سے منقول ہے، جب کہ یہ جملہ محض ایک شاگرد سے منقول ہے، لہذا توثیق والا قول راجح ہے۔

---

(۱) حجۃ اللہ البالغۃ: ۲/ ۴۷۸

(۲) ترمذی، رقم: ۲۴۹۹

ثانیاً: ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ "لا یکتب حدیثہ" کا جملہ کیا واقعتا جرح کا جملہ ہے اور جرح کا ہے تو کیا جرح مبہم ہے یا جرح مفسر ہے، مشہور غیر مقلد عالم عبدالرحمن معلمی یمانی ابن معین کے قول "لا نکتب حدیثہ" جو لا یکتب حدیثہ کے ہم معنی ہے، کے بارے میں لکھتے ہیں:

أن کلمة لا تکتب حدیثه لیست بصریحة فی الجرح (۴)

"لا نکتب حدیثہ" کا جملہ جرح کے باب میں صریح نہیں ہے۔

جب یہ جرح صریح ہی نہیں ہے تو پھر اس کی بنیاد پر توثیق کے صریحی اقوال کو کیسے مرجوح قرار دیا جا سکتا ہے، اصول اور قاعدہ کی رو سے بھی دیکھیں تو صراحت کو شک پر اور تفسیر کو ابہام پر ترجیح حاصل ہوتی ہے، اسی طرح ابن معینؒ کے توثیقی کلمات جو صریح اور واضح ہیں، ان کو اس مبہم اور شک والے جرح پر ترجیح حاصل ہوگی۔

ثالثاً: امام یحیی بن معین کو جرح وتعدیل کے باب میں متشدد مانا گیا ہے اور ایسے ناقدین کے بارے میں محدثین کرام کا طرز عمل یہ رہا ہے کہ متشدد ناقدین کی جرح کو تو چھان بین کے بعد قبول کیا جاتا ہے، لیکن ان کی توثیق کو بڑے اعتبار کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے؛ کیونکہ ایک متشدد ناقد کی جانب سے کسی راوی کی توثیق ہی اس بات کا اعلان ہے کہ اس نے اس بارے میں پوری کوشش کر لی ہے اور اس کو اس راوی کے بارے میں جرح کا خفیف امکان بھی نظر نہیں آیا، تبھی اس نے اس راوی کی توثیق کی ہے، لہذا اگر ابن معین کی اس جرح کو مفسر تسلیم کر لیا جائے، شاگردوں کی جماعت پر ایک شاگرد کے نقل کو ترجیح دے بھی دی جائے تو بھی دیگر ائمہ جرح وتعدیل نے امام ابو یوسف کی جو توثیق کی ہے، جن کے حوالے ماقبل میں گزر چکے، اس کے بالمقابل یہ قول نا قابل تسلیم ہوگا۔

امام عبداللہ بن مبارک

امام عبداللہ بن مبارک کی شخصیت ائمہ اسلام میں مہر درخشاں کی طرح روشن اور تابناک نظر آتی ہے اور وہ ان معدودے چند روات میں سے ایک ہیں، جن کے ترجمہ کا دامن کسی بھی قسم کی جرح سے پاک ہے، ورنہ جرح وتعدیل کا باب ایسا ہے کہ اچھے اچھوں کے دامن پر کسی نہ کسی گوشے سے جرح کی کوئی نہ کوئی چھینٹ پڑ ہی جاتی ہے، دور کیوں جائیں، امام المحدثین امام بخاری پر ان کے معاصر ابوزرعہ اور ابوحاتم نے جو چھینٹا کشی کی ہے، وہ اس کی واضح مثال ہے، عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں:

إني لأكره أن أجلس في مجلس يذكر فيه يعقوب (۵)

میں ایسی مجلس میں شرکت ناگوار خاطر سمجھتا ہوں، جس میں ابو یوسف کا ذکر بھی کیا جائے۔

امام عبداللہ بن مبارک سے یہ بھی منقول ہے کہ ایک شخص نے ان سے مسئلہ پوچھا، عبداللہ بن مبارک نے اس مسئلہ کا جواب بتایا، اس آدمی نے کہا کہ آپ نے اس مسئلہ کی بابت جو کچھ کہا ہے، امام ابو یوسف کی رائے اس کے برخلاف ہے، اس پر عبداللہ بن مبارک نے فرمایا:

إن كنت صليت خلف أبي يوسف فانظر صلاتك (٦)

اگر تم نے ابو یوسف کے پیچھے نماز پڑھی ہے تو اس پر غور کرلو۔

عبدہ بن سلیمان مروزی کہتے ہیں کہ میں نے ہمیشہ یہ دیکھا کہ جب کبھی عبداللہ بن مبارک کی مجلس میں امام ابو یوسف کا ذکر آتا تو آپ اس کی دھجیاں اڑادیتے (یعنی شدید جرح کرتے) اور ایک دن آپ نے ابو یوسف کے بارے میں فرمایا:

ان لوگوں میں سے (شاہی خاندان خلافت عباسیہ) کسی نے اپنے باپ کی جماع شدہ لونڈی (یعنی سوتیلی ماں) سے عشق کیا، پھر اس نے ابو یوسف سے اس لونڈی کے حصول کیلئے طریقہ دریافت کیا تو ابو یوسف نے جواب دیا، اس لونڈی کو سچا نہ سمجھو اور اس کو تصرف میں لے آؤ، پس وہ آدمی ابو یوسف کیلئے حصے مقرر کرنے لگا، اور ابن مبارک ابو یوسف پر شدید جرح کرنے لگے۔(۷)

ذیل میں ان جرحوں کے ترتیب وار جوابات ذکر کئے جاتے ہیں:

اولاً: یہ جرح امام یعقوب الفلاس کی کتاب ''المعرفۃ والتاریخ'' عبداللہ بن جعفر درستویہ نامی راوی سے منقول ہے، یہ راوی خود متکلم فیہ ہے،(۸) لہذا ایسے متکلم فیہ راوی کی سند سے امام ابو یوسف جیسے جبل علم پر کوئی نقد کرنا درست نہیں ہے۔

ثانیا: اگر اس قول کی سند کو درست تسلیم کر بھی لیا جائے تو یہ لازم نہیں آتا کہ اس سے وہی معنی مراد ہو، جیسا کہ ظاہر میں لیا جارہا ہے، عبداللہ بن مبارک کے قول کی یہ مراد بھی ہوسکتی ہے کہ میں کسی ایسی مجلس میں بیٹھنے کا روادار نہیں ہوں، جہاں امام ابو یوسف جیسی شخصیت کی برائی کی جارہی ہو، علاوہ ازیں عبداللہ بن مبارک کا علم وعمل میں جو مقام ہے، اس کو بھی دیکھتے ہوئے بظاہر یہی بات صحیح لگتی ہے کہ وہ تو کسی ایسی مجلس میں بھی بیٹھنے کے

روادار نہیں ہوں گے، جہاں کسی عام مسلمان کی بھی برائی کی جا رہی ہو، چہ جائیکہ امام ابو یوسف جیسے اسلامی علوم وفنون کے متبحر عالم باعمل کی برائی کی جائے۔

یہ بھی واضح رہنا چاہئے کہ کسی قول کی جب تک کوئی صحیح توجیہ ممکن ہو، تب تک اس کو ایسے معنی پر محمول نہیں کرنا چاہئے، جس سے کسی شخصیت پر زد پڑتی ہو، اور یہی بات غیر مقلد علماء نے بھی لکھی ہے،؛ چنانچہ مشہور غیر مقلد عالم مولانا یحیی گوندلوی لکھتے ہیں:

> یاد رکھنا چاہئے، حتی الامکان اگر کوئی کلام کسی توجیہ سے صحیح بن سکتا ہے تو اس کو صحیح ہی سمجھنا چاہئے (۹)

عبداللہ بن مبارک کا دوسرا قول جو عقیلی کے ضعفاء کے حوالہ سے منقول ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ اولاً خود امام عقیلی نہایت متشدد راوی ہیں، اور کمزور جرحوں پر بڑے فیصلے صادر کر دیتے ہیں، یہاں تک کہ حافظ ذہبی جیسے معتدل اور ٹھنڈے مزاج محدث کو بھی ان کے بارے میں یہ کہنا پڑ گیا :

أفما لك عقل يا عقيلي(۱۰)

اے عقیلی کیا تمہیں عقل نہیں ہے، تم کن پر جرح کر رہے ہو۔

دوسرے احناف سے ان کو بطور خاص کدورت خاطر ہے، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ائمہ احناف کے ترجمہ میں کوئی کلمہ خیر ذکر نہیں کیا ہے، اور اس کی تلافی ان کے شاگرد اور ''الضعفاء'' کے راوی ابن دخیل نے امام ابوحنیفہ کے مناقب پر کتاب لکھ کر کی، جس کی بیشتر روایات کو ابن عبدالبر نے ''الانتقاء'' میں منذر بن الحکم کے واسطہ سے نقل کیا ہے، پھر یہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ عقیلی کی روایت کی سند میں عقیلی کے استاد ہیثم بن خلف بھی متکلم فیہ ہیں، مشہور محدث اسماعیلیؒ ان کے بارے میں فرماتے ہیں:

أنه كان لا يخالف ما فيه كتابه وإن عمله خطأ(۱۱)

> یہ اپنی کتاب میں لکھی بات کی صحت پر- چاہے غلط ہی کیوں نہ لکھا ہو- اصرار کرتے تھے اور ان کا یہ طرز عمل غلط تھا۔

امام اسماعیلی نے ان کے اس غلط طرز عمل کی یہ مثال بھی پیش کی ہے کہ ان کی کتاب میں ایک راوی کا نام محمود کے بجائے غلط طور پر محمد بن ربیع تھا، ہیثم جب روایت کرتے تو اس راوی کا غلط نام ہی لیتے تھے(۱۲) نیز احمد بن السکری نے اس کی ایک روایت کو ''غریب جدا'' قرار دیا ہے،(۱۳)

اور خود ایک غیر مقلد عالم زبیر علی زئی نے غریب کا مفہوم غلط اور باطل ہونا بیان کیا ہے؛ چنانچہ موصوف لکھتے ہیں:

ہیثم بن عدی کے قول کو حافظ ابن کثیر نے ''زعم'' کہہ کر ذکر کیا ہے اور ''ھذا غریب'' کہہ کر اس کے غلط اور باطل ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ (۱۴)

یہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ یہ قول جرح کے باب میں صریح نہیں ہے؛ کیونکہ اولا تو اس قول کا جرح وتعدیل سے براہ راست کوئی واسطہ نہیں، دوسرے نماز کو دیکھ لینے یا اس میں غور کر لینے سے کیا مراد ہے، جو مطلب بھی مراد لیں، چاہے ذم والا یا مدح والا، اس کیلئے کوئی دلیل نہیں ہے اور ایسی جرح جو مبہم اور جس کے مراد میں کئی احتمال ہوں، اس سے استدلال کرنا درست نہیں ہوتا۔

اس روایت کے بارے میں مجموعی اعتبار سے دیکھیں تو اولاً عقیلی جو اس قول والی کتاب کے مصنف ہیں، متشدد اور متعنت ہیں، احناف کے خلاف بطور خاص کدورت رکھتے ہیں، ان کا شیخ متکلم فیہ ہے، خود یہ قول اپنے معنی اور مراد پر واضح نہیں، یہ سب مل ملا کر اس بات کو تقویت پہنچاتی ہیں کہ یہ روایت اس قابل نہیں کہ اس کو امام ابو یوسف جیسے مشہور عالم شخصیت پر جرح کے باب میں کافی مان لیا جائے۔

جہاں تک عبداللہ بن مبارکؒ کے تیسرے قول کی بات ہے تو اس کی سند میں ایک راوی احمد بن جمیل المروزی ہے، اس راوی کے بارے میں مشہور محدث یعقوب بن شیبہ کہتے ہیں:

وقال یعقوب بن شیبۃ صدوق لم یکن بالضابط (۱۵)

اگر چہ فی نفسہ سچے تھے؛ لیکن حافظہ درست نہیں تھا، باتوں کو یاد رکھنے پر قادر نہیں تھے۔

ایسے شخص کی روایت میں یہ عین ممکن ہے کہ عبداللہ بن مبارک نے کچھ فرمایا ہو اور اس نے کچھ اور یاد رکھا ہو اور روایت کرتے ہوئے اسی کچھ دوسرے یاد کو نقل کر دیا ہو، اور علم وفن کی دنیا میں اس کی مثالیں کم نہیں ہیں، جہاں بات کا بتنگڑ بن جاتا ہے، رائی کا پربت اور سوئی کا بلم بھالا بنا دیا جاتا ہے، علاوہ ازیں اس بات کا تعلق نہ عدالت سے ہے اور نہ حفظ وضبط سے، اس کا تعلق اجتہادی مسائل میں ایک دوسرے کو خطاوار قرار دینے سے ہے اور اس کی بنیاد پر کسی کی عدالت اور حفظ وضبط پر کلام نہیں کیا جا سکتا، ورنہ تو ائمہ اربعہ اور کبار فقہاء ومجتہدین بھی اس کی زد میں آئیں گے، پھر یہ بات بھی واضح رہنی چاہئے کہ امام ابو یوسف کا زہد واتقاء اتنا معمولی نہیں ہے کہ وہ چند دراہم دنیا کیلئے اپنی آخرت بیچ دیں، انہوں نے جس طرح اپنے عہد کے سب سے باجبروت

بادشاہ ہارون رشید کو کتاب الخراج میں نصیحت کی ہے اور راہ راست پر گامزن رہنے کی تلقین کی ہے، کیا اس کے بعد یہ بات ممکن ہے کہ وہ محض چند دراہم ودینار کیلئے اپنی آخرت بیچ دیں۔

پھر یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ حکومت وسلطنت کے امور میں شریک ہونے یا حکام کے ساتھ خلط ملط ہونے کے بارے میں عبداللہ بن مبارک کے جذبات بہت شدید تھے، وہ اہل علم کیلئے حکام وامراء سے کسی قسم کا میل جول پسند نہ کرتے تھے، خود ان کا کوئی ساتھی اگر کسی امیر ووزیر کی محفل میں شریک ہوتا تو اس سے قطع تعلق کر لیتے اور اس پر ملامت کرتے، کتابوں میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ:

> ایک مرتبہ کسی خلفاء عباسیہ کے کپڑے سینے والے درزی نے ان سے پوچھا کہ کیا بادشاہوں کے کپڑے سینے کی وجہ سے میرا بھی شمار ظالموں کے معاونوں میں ہوگا، عبداللہ بن مبارک نے فرمایا کہ ظالم کے معاون تو وہ ہیں جنہوں نے ان کیلئے سوت کاتا ہے، تمہارا شمار تو ظالموں میں ہوگا۔

اس کے بالمقابل دیکھئے تو امام ابو یوسف قاضی القضاۃ تھے، حکومت کے ایک انتہائی اہم عہدے پر فائز تھے، خلفاء عباسیہ اور حکومت کے ارا کین وحکام سے رات دن کا میل جول تھا، ایسے میں عبداللہ بن مبارک کے امام ابو یوسف کے تعلق سے جذبات جتنے شدید ہوں گے، اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ عبداللہ بن مبارک کی تنقیدات میں کہیں یہ نہیں ملتا کہ امام ابو یوسف کسی خراب کیریکٹر کے حامل ہیں، ان کے حفظ وضبط میں کوئی کمی ہے، ان کی عدالت میں کوئی خامی ہے؛ بلکہ صرف حکام کے ساتھ میل جول پر سخت تنقید ہے اور حکام سے میل جول رکھنے سے راوی ضعیف نہیں ہو جاتا، اس کی تصریح کتب اصول حدیث میں متعدد محدثین نے کی ہے۔

یہ بات کہ عبداللہ بن مبارک کے جذبات امام ابو یوسف کے تعلق سے حکومتی مشنری میں شمولیت کی وجہ سے تھی، اس کی تصریح خود مشہور غیر مقلد عالم عبدالرحمن معلمی نے بھی کی ہے؛ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> وقد كان ابن المبارك شديدا على أبي يوسف لولايته القضاء، ومجالسته الخلفاء، وقد غضب ابن المبارك على إسماعيل بن إبراهيم ابن علية لولايته شيئا خفيفا(۱۶)

عبداللہ بن مبارک کے امام ابو یوسف پر سخت تنقید کی وجہ امام ابو یوسف کا عہدۂ قضا قبول کرنا اور خلفاء کی ہم نشینی اختیار کرنا ہے، اس کی تصدیق اس سے بھی ہوتی ہے کہ عبداللہ بن مبارک ابراہیم بن علیہ پر معمولی

حکومتی منصب قبول کرنے پر سخت ناراض ہوئے تھے۔

یہ بات واضح رہے کہ ابراہیم بن علیہ صحاح ستہ کے راوی ہیں اور عبداللہ بن مبارک کی ناراضگی کے باوجود تمام محدثین نے ان کی ثقاہت کو تسلیم کیا ہے اوران سے اپنی حدیثی تصنیفات کو زینت بخشا ہے، اور عبداللہ بن مبارک کی ناراضگی کو حکومت سے میل جول کی ناراضگی قرار دیا ہے، جو راوی کی ثقاہت کیلئے مضر نہیں، اسی طرح امام ابو یوسف پر بھی عبداللہ بن مبارک کی ناراضگی اور تنقید حکومت کے ارکان سے میل جول کا شاخسانہ ہونے کی وجہ سے قابل اعتبار قرار نہیں دیا جاسکتا اور نہ ہی ان کی وجہ سے امام ابو یوسف کی صاف شفاف شخصیت پر کوئی داغ آئے گا۔

امام عبداللہ بن ادریس کوفی

آپ مشہور محدث ہیں، امام ابو یوسفؒ کے بارے میں آپ سے منسوب ایک جملہ کتب جرح وتعدیل میں ملتا ہے، جسے عقیلی نے بھی نقل کیا ہے اور وہ یہ ہے:

وأبو يوسف فاسقا من الفاسقين (۱۷)

اور ابو یوسف فاسقوں میں سے ایک فاسق تھا۔

نیز آپ سے ہی منسوب ایک اور قول ملتا ہے، جس میں عبداللہ بن ادریس کہتے ہیں:

سمعت ابن إدريس، يقول: رأيت أبا يوسف والذي ذهب بنفسه بعد موته في المنام يصلي على غير قبلة وسمعت وكيعا وسأله رجل عن مسألة , فقال الرجل: إن أبا يوسف يقول كذا وكذا فحرك رأسه وقال: أما تتقي الله بأبي يوسف تحتج عند الله(۱۸)

میں نے ابو یوسف کو اس کے مرنے کے بعد خواب میں دیکھا، وہ قبلہ کے علاوہ رخ میں نماز پڑھ رہا تھا، اور یحییٰ بن محمد بن سابق نے کہا کہ میں نے ایک آدمی کو وکیع بن جراح سے مسئلہ پوچھتے ہوئے سنا تو اس آدمی نے کہا کہ ابو یوسف تو اس مسئلہ کے جواب میں آپ سے الگ رائے رکھتے ہیں، وکیع نے (غصے سے) سر کو حرکت دیتے ہوئے اس شخص سے کہا کہ کیا تمہیں خدا کا خوف نہیں ہے، کیا تم اللہ تعالیٰ کے دربار میں ابو یوسف سے حجت پکڑو گے۔

اس روایت کی سند درست ہے اوراس روایت کے ایک راوی یحیی بن محمد بن سابق کوحافظ ذہبی نے کاشف میں ثقہ قرار دیا ہے۔

ابن ادریس کوفہ کے رہنے والے تھے، جیسا کہ ان کی نسبت سے واضح ہے، لیکن علماء کوفہ اور بالخصوص فقہاء احناف کے سخت مخالف تھے، اور جرح وتعدیل میں غیر محتاط تھے، یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف وہ جہاں امام ابویوسف کو فاسق کہہ رہے ہیں، وہیں امام ابوحنیفہ کو گمراہ کہہ رہے ہیں اور قرأت کے امام حمزہ کو اہل سنت والجماعت سے خارج سمجھ رہے ہیں۔

حافظ ذہبی نے امام یعقوب بن شیبہ سے ابن ادریس الکوفی کے بارے میں نقل کیا کہ وہ اہل کوفہ کے مخالف تھے:

قال يعقوب ابن شيبة: كان عابدا، فاضلا، كان يسلك في كثير من فتياه ومذاهبه مسالك أهل المدينة، يخالف الكوفيين(۱۹)

عبداللہ بن ادریس کوفی نہایت عبادت گزار، علم وفضل کے مالک تھے، اہل مدینہ کے مسلک پر عمل پیراں تھے اور کوفہ والوں کے مخالف تھے۔

اور حمزہ بن حبیب کے بارے میں حافظ ذہبی ان کا قول نقل کرتے ہیں:

قال ابن إدريس: ما أستجيز أن أقول لمن يقرأ لحمزة: إنه صاحب سنة (۲۰)

میں اس شخص کو اہل سنت میں شامل سمجھنا جائز نہیں سمجھتا، جو حمزہ کی قراءت کے مطابق قرآن پڑھتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ حمزہ تو دور رہے، جو کوئی حمزہ کی قرات کے مطابق قرآن پڑھے، وہ بھی اہل سنت والجماعت کے دائرہ سے باہر ہے، یہی مزاج ہے جس کو ''من شک فی کفرہ فقد کفر'' سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ حافظ ذہبی ان کے اس قول کو نقل کرنے کے بعد اس پر رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

والله يغفر له، وقد تلقى المسلمون حروفه بالقبول، وأجمعوا اليوم عليها(۲۱)

اللہ ان کی مغفرت کرے، مسلمانوں نے حمزہ کی قرات کو قبول کیا ہے اور آج تو ان

کی قرات کی صحت پر اجماع ہے۔

ابن ادریس کوفی کی جرح کئی وجوہ کی بناء پر قابل اعتبار نہیں ہے:

اولاً: عبداللہ بن ادریس جرح میں متشدد ہیں اور متشدد کی جرح کا اعتبار نہیں ہوتا ہے۔

ثانیاً: وہ کوفہ کے اہل علم کے مخالف ہیں اور کسی شہر والوں سے خاص عداوت رکھنے والوں کی جرح اس شہر کے اہل علم کے خلاف معتبر نہیں مانی جاتی، جیسے جوزقانی کی جرح اہل کوفہ کے خلاف اور ابن سعد کی جرح اہل کوفہ کے خلاف محدثین نے رد کر دیا ہے اور جس کی صراحت حافظ ابن حجر نے فتح الباری کے مقدمہ ''ہدی الساری'' میں کی ہے۔

ثالثاً: ابن ادریس امام ابو یوسف کے ہم عصر ہیں اور معاصرت اپنے معاصرین اہل علم وفضل کی عظمت کو تسلیم کرنے میں اکثر رکاوٹ بنتی ہے، اور اسی لئے یہ قاعدہ بھی کتب جرح وتعدیل میں مرقوم ہے کہ معاصرین کی جرح اپنے معاصرین کے خلاف قبول نہیں کی جائے گی؛ چنانچہ مشہور غیر مقلد عالم ارشاد الحق اثری لکھتے ہیں:

> اہل علم نے "**المعاصرة أصل المنافرة**" کا معروف جملہ ایسے ہی موقع پر استعمال کیا ہے، اور ایسی جرح بالاتفاق قابل تسلیم نہیں ہے۔

رابعاً: یہ جرح جرح مبہم ہے، یعنی فسق کا الزام تو عائد کیا گیا ہے؛ لیکن اس فسق کا الزام عائد کرنے کی وجہ کیا ہے، اس کی کوئی تفصیل نہیں بتائی گئی ہے، ہوسکتا ہے کہ جو وجہ ابن ادریس کوفی کے ذہن وخیال میں فسق کیلئے کافی ہو، وہ دراصل فسق نہ ہو اور بعض علماء نے اس کام کے کرنے کی رخصت دی ہو، اس کی مثالیں کتب فقہ میں بہت ساری ہیں، لہذا بغیر دلیل کے محض فسق کے الزام سے کوئی فاسق نہیں ہوجاتا ہے۔

جہاں تک ابن ادریس کے خواب کی بات ہے تو خواب وخیال کی بات کا جرح وتعدیل کے باب میں کوئی اعتبار نہیں ہے، ویسے بھی خواب کو حدیث نبوی میں تین وجوہ سے مربوط کیا گیا ہے، رحمانی، شیطانی اور حدیث نفس، ایسا لگتا ہے کہ ان کا خواب حدیث نفس پر مشتمل ہے، مطلب جو کچھ ان کی زندگی میں ان کی بابت خیال کرتے رہے، اسی کو ان کے انتقال کے بعد دیکھا، وہ امام ابو یوسف کو زندگی بھر اگر فاسق سمجھتے رہے، تو اسی کا نتیجہ خواب میں برآمد ہوا کہ ان کو غیر قبلہ کی طرف نماز پڑھتے دیکھا، دوسرے یہ ضروری نہیں کہ اگر خواب برا ہو تو اس کی تعبیر بھی بری ہو، بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ خواب بظاہر بہت برا ہوتا ہے اور تعبیر اس کی بہت اچھی ہوتی ہے، یہاں بھی یہ صورت ہوسکتی ہے، بشرطیکہ دل میں گنجائش، اور ذرا سا حسن ظن ہو، خود اہل حدیث حضرات بھی

اسی کے قائل ہیں کہ خواب حجت شرعیہ نہیں ہے اور نہ ہی خوابوں پر دین کا دارومدار ہے، (۲۳)

اور اگر خواب پر ہی دارومدار ہے تو امام ابو یوسف کے بارے میں جو رویائے صالحہ دیکھے گئے ہیں ان پر بھی عقیلی کو توجہ کرنی چاہئے تھی، خطیب بغدادی نے محمویہ (جو کہ ابدال میں سے تھے) سے نقل کیا ہے:

حدثني ابن أبي رجاء القاضي قال سمعت محمويه- و كنا نعده من الأبدال- قال رأيت محمد ابن الحسن في المنام فقلت: يا أبا عبد الله إلام صرت؟ قال قال لي: إني لم أجعلك وعاء للعلم وأنا أريد أن أعذبك. قلت فما فعل أبو يوسف؟ قال فوقي. قلت فما فعل أبو حنيفة؟ قال فوق أبي يوسف بطبقات(۲۴)

میں نے امام محمد کو ان کی وفات کے بعد خواب میں دیکھا اور ان سے پوچھا کہ آپ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا؟ انہوں نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے مجھ سے فرمایا کہ میں نے تجھے اس لئے علم نہیں دیا تھا کہ تجھے عذاب دوں، امام محمویہ فرماتے ہیں، میں نے پوچھا کہ امام ابو یوسف کا کیا حال ہے؟ فرمایا: وہ مجھ سے جنت میں ایک درجہ اوپر ہیں، میں نے امام ابوحنیفہ کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا، وہ تو اعلیٰ علیین میں ہیں۔

امام یزید بن ہارونؒ

امام یزید بن ہارون امام ابو یوسف پر جرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

قلت ليزيد بن هارون: ما تقول في أبي يوسف؟ قال: لا يحل الرواية عنه, إنه كان يعطي أموال اليتامى مضاربة ويجعل الربح لنفسه(۲۵)

محمود بن گیلان فرماتے ہیں کہ میں نے یزید بن ہارون سے امام ابو یوسف کے متعلق استفسار کیا تو جواباً انہوں نے فرمایا کہ اس سے روایت کرنا حلال نہیں ہے؛ کیونکہ یہ (ابو یوسف) یتیموں کے مال کو مضاربت (تجارت) میں لگا دیتا تھا اور اس کا نفع خود رکھ لیتا تھا۔

اس قول کی سند صحیح نہیں ہے؛ کیونکہ اس کی سند میں ایک راوی احمد بن علی الآبار ہے جو کہ الخیوطی سے مشہور ہے، حافظ ذہبی نے اس کو ضعفاء میں ذکر کیا ہے اور اس کے بارے میں لکھا ہے:

أحمد بن علی الخیوطی عن ابن مبشر الواسطی، فذکر خبرا موضوعا (۲۶)

احمد بن علی خیوطی نے علی بن عبداللہ واسطی سے موضوع حدیث روایت کی ہے۔

جو شخص رسول اللہ ﷺ کی طرف کوئی جھوٹ منسوب کرسکتا ہے، اس سے کیا بعید ہے کہ وہ امام ابو یوسف کی جانب یا یزید بن ہارون کی جانب غلط اقوال منسوب نہ کردے، احمد بن علی نے امام یزید بن ہارون کی جانب یہ قول غلط منسوب کیا ہے، اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ امام یزید بن ہارون، امام ابو یوسفؒ کے بارے میں کہتے ہیں:

قال محمود بن غیلان قلت لیزید بن ھارون ما تقول فی أبی یوسف فقال أنا أروی عنه (۲۷)

میں ابو یوسف سے حدیث روایت کرتا ہوں۔

اگر یزید بن ہارون امام ابو یوسف سے روایت کرنا حلال ہی نہیں سمجھتے تو پھر وہ ان سے روایت کرنے کے روادار کیسے ہوگئے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ روایت حلال نہ ہونے والی بات احمد بن علی کی کارستانی اور اس کا گھڑا ہوا جھوٹ ہے۔

یہ بات بھی غلط ہے کہ امام ابو یوسف یتیموں کا مال باطل طور پر کھا جایا کرتے تھے؛ کیونکہ امام ابو یوسف سے خطیب بغدادی نے خود نقل کیا ہے کہ انہوں نے مرض وفات میں فرمایا:

اللھم إنك تعلم أنی لم آکل درھما حراما قط وأنا أعلم (۲۸)

اے اللہ آپ جانتے ہیں کہ میں نے دیدہ ودانستہ کوئی حرام لقمہ پیٹ میں نہیں ڈالا۔

لہذا امام ابو یوسفؒ کے اپنے جواب کی روشنی میں بھی یزید بن ہارون کا قول بر بنائے تسلیم غلط ثابت ہوتا ہے، یہ سارے جوابات تو الزامی نوعیت کے تھے؛ لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ یزید بن ہارون کے قول کو نہ درست طور پر سمجھا گیا اور نہ امام ابو یوسف کے فعل کی حقیقت وماہیت کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں بینک وغیرہ کا وجود تو نہیں تھا، ہوتا یہ تھا کہ لوگ اپنے اموال کسی امانت دار شخص کے پاس بطور

امانت رکھ دیتے تھے، ایسے لوگ بھی اپنی امانت رکھواتے تھے، جن کو لگتا تھا کہ اب ان کی موت قریب ہے اور جب ان کے بچے بلوغ کو پہنچ جائیں گے تو کچھ مال ان کو مل جائے، ایسے لوگ بھی اپنے اموال کو شہر کے کسی امانت دار معزز شخص کے پاس محفوظ کرا دیتے تھے کہ ان کے انتقال کے بعد یا ان کے بچوں کے بلوغ کے بعد ان کی امانت ان کے سپرد کر دی جائے، یتیموں کا مال امام ابو یوسف کے پاس رکھوایا جانا ہی ان کے امانت ودیانت کا کافی ثبوت ہے، شرعی مسئلہ یہ ہے کہ اگر امانت کا مال ہلاک ہو جائے تو امین اس کا ذمہ دار نہیں ہوتا، برخلاف قرض کے، کہ قرضدار قرض لوٹانے کا ذمہ دار ہوتا ہے، امام ابو یوسف یتیموں پر شفقت کی بنیاد پر کرتے یہ تھے کہ یتیموں کے اموال کو امانت نہیں بلکہ قرض کے طور پر لیتے تھے؛ کیونکہ قرض میں قرضدار کو ہر حال میں مال لوٹانا لازمی ہوتا ہے اور اس طرح یتیموں کا مال محفوظ ہو جاتا ہے، اب یتیموں کا مال بطور قرض لینے کے بعد وہ اس کو تجارت میں لگاتے تھے اور اس کا نفع حاصل کرتے تھے، اس میں شرعی اعتبار سے کوئی قباحت نہیں، بلکہ امام ابو یوسف کی دقت نظری کا ثبوت ہے کہ مال یوں ہی کسی گوشے میں دبا نہیں رہتا، بلکہ گردش میں رہتا ہے، یتیموں کا مال محفوظ رہتا ہے اور اس سے نفع بھی ہوتا ہے، شاید امام یزید بن ہارون نے مسئلہ کی اصل نوعیت کو نہ سمجھ کر یہ سمجھا کہ وہ یتیموں کا مال تو تجارت میں لگا دیتے ہیں اور نفع خود کھا لیتے ہیں، یہ محض ان کی غلط فہمی تھی، ورنہ مسئلہ کی حقیقی نوعیت وہی تھی جو ابھی آپ کے سامنے ذکر کی گئی ہے۔

امام مالک بن انسؒ

عقیلی معن بن عیسیٰ سے نقل کرتے ہیں:

عن معن بن عيسى قال: دخل مالك بن أنس على أمير المؤمنين هارون وهو بالمدينة ومعه أبو يوسف قال: فقال له: يا أبا عبد الله هذا أبو يوسف القاضي قال ذلك مرتين فقلت نعم يا أمير المؤمنين ولم ألتفت إليه قال ذلك مرتين أو ثلاثة قال أبو يوسف: يا أبا عبد الله ما تقول في مسألة كذا و كذ قال: فقلت: يا هذا إذا رأيتني جلست مجلس أهل الباطل فتعال فاسألني(۲۹)

مشہور عباسی خلیفہ ہارون رشید ایک بار مدینہ آیا، امام مالک ہارون رشید سے ملاقات

کیلئے تشریف لے گئے، اور ہارون رشید کے ساتھ امام ابو یوسف بھی تھے، ہارون رشید نے امام ابو یوسف کا امام مالک سے تعارف کراتے ہوئے کہا کہ اے ابو عبداللہ: یہ ابو یوسف قاضی ہیں، ہارون رشید نے یہ بات دو مرتبہ کہی، امام مالک ہاں ہاں کہتے رہے، لیکن نظر اٹھا کر امام ابو یوسفؒ کی جانب نہیں دیکھا، جب امام ابو یوسف نے امام مالک سے کسی مسئلہ کی بابت ان کی رائے دریافت کی تو امام مالک نے فرمایا: اے فلاں! جب تم اہل باطل کی مجلس میں مجھے بیٹھا ہوا دیکھو تو اس وقت آ کر مسئلہ پوچھنا۔

بعض لوگوں نے اس روایت کی سند کو صحیح مانا ہے؛ لیکن یہ ان کی غلطی ہے؛ کیونکہ اس سند کے ایک راوی عبداللہ بن احمد شیویہ کی توثیق سوائے ابن حبان کے کسی اور سے منقول نہیں ہے اور ابن حبان توثیق میں متساہل ہیں؛ کیونکہ ان کا ماننا یہ ہے کہ اگر کسی راوی کی عدالت وثقاہت معلوم نہ ہو لیکن اس راوی کا شیخ اور شاگرد ثقہ ہو تو اس راوی کی بھی توثیق کی جائے گی، یہی وجہ ہے کہ علمائے جرح وتعدیل تنہا ابن حبان کی توثیق پر زیادہ اعتماد نہیں کرتے ہیں، اور خود غیر مقلد علماء بھی تنہا ابن حبان کی توثیق کو غیر معتبر قرار دیتے ہیں، دوسرے بات یہ ہے کہ اس سند میں بھی عقیلی کے شیخ ہیثم بن خلف متکلم فیہ ہیں، جس کے بارے میں تفصیل حضرت عبداللہ بن مبارک کی جرح کے جواب میں گزر چکی ہے، یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ اس روایت کے بنیادی راوی عیسی بن معن اس کی صراحت نہیں کرتے کہ یہ واقعہ ان کا آنکھوں دیکھا واقعہ ہے، یا پھر یہ کہ انہوں نے یہ واقعہ کس سے سنا ہے، لہذا جب تک اس کی صراحت نہ ہو جائے کہ عیسی بن معن اس واقعہ کے چشم دید گواہ ہیں یا پھر انہوں نے جس سے یہ بات سنی ہے، وہ ثقہ ہے، تب تک اس روایت پر اعتماد واعتبار نہیں کیا جا سکتا اور اس کی صراحت امام ابن حزم ظاہری نے بھی کی ہے؛ چنانچہ وہ ابن اسحاق کی ایک روایت جس میں انہوں نے ''قال'' کا صیغہ استعمال کیا ہے، اس کو اسی بنیاد پر منقطع قرار دیتے ہیں کہ یہ جملہ تحدیث اور خبر میں صریح نہیں ہے۔

ثانیا: اس واقعہ سے امام ابو یوسف کے اہل باطل میں ہونے پر استدلال کرنا اس لحاظ سے غلط ہے کہ امام مالک نے صراحتاً یہ نہیں کہا کہ آپ اہل باطل میں سے ہیں، بلکہ یہ کہا ہے کہ جب آپ مجھے اہل باطل میں بیٹھا دیکھیں تو اس وقت یہ مسئلہ پوچھیں، یہ عین ممکن ہے کہ امام مالک کے نزدیک امام ابو یوسف کا دریافت طلب مسئلہ بے بنیاد اور صراحتاً غلط ہو، اس بنیاد پر انہوں نے یہ بات کہی ہو، اس سے سائل اور مسئول کسی کا اہل باطل میں سے ہونا ثابت نہیں ہوتا، اردو میں یہ اسلوب کلام عام ہے، مثلاً کسی کی کوئی چیز گم ہو جائے اور وہ کسی

سے دریافت کرے اور جس سے دریافت کیا گیا ہو، اس کو اس دریافت سے رنجیدگی ہو تو وہ کہے گا کہ اگر تم مجھ کو چور سمجھتے ہو تو مجھ سے پوچھو، یہ بات قابل لحاظ ہے کہ امام مالک نے فرمایا کہ جب تم مجھ کو اہل باطل کی مجلس میں بیٹھا دیکھو، اس کا مفہوم مخالف یہ ہوا کہ امام ابو یوسف اس وقت جس مجلس میں تھے، وہ اہل حق کی مجلس تھی۔

اس واقعہ کی اگر درست توجیہ نہ کی جائے تو معاذ اللہ اس کی زد خود امام مالک پر پڑتی ہے کہ وہ اہل باطل کی مجلس منعقد کرتے تھے، جبھی تو فرمایا کہ جب میں اہل باطل کی مجلس میں بیٹھوں تب مجھ سے آکر مسئلہ پوچھنا۔

ثالثاً: امام مالک روایت حدیث میں متشدد ہیں اور بہت چھان بین اور جستجو وتفتیش کے بعد ہی روایت کے سلسلے میں کسی پر اعتماد کرتے ہیں، اور روایت کرنے کے لائق سمجھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ مشہور غیر مقلد عالم مولانا ارشاد الحق اثری نے امام مالک کی جرح کے جواب میں لکھا ہے:

> امام مالک کے متعلق بھی اہل علم کو شکوہ ہے کہ وہ ناروا طور پر ائمہ ثقات ومعروفین پر کلام کرتے ہیں اور ان سے روایت نہیں لیتے۔(۳۰)

ایک دوسرے غیر مقلد عالم زبیر علی زئی نے لکھا ہے کہ امام مالک بلاوجہ ذاتی دشمنی کی بناء پر بھی جرح کر دیا کرتے تھے:

> امام مالک وغیرہ نے ذاتی دشمنی کی وجہ سے انہیں شدید جروح کا نشانہ بنایا ہے۔

مولانا ارشاد الحق وزبیر علی زئی کے ارشادات کے بعد امام ابو یوسف کے خلاف امام مالک کے اس جرح کی کیا قدر وقیمت رہ جاتی ہے، وہ اہل علم پر مخفی نہیں ہے۔

امام سفیان ثوریؒ

عبید اللہ بن موسیٰ فرماتے ہیں: سفیان ثوری کے سامنے امام ابو یوسفؒ کا ذکر کیا گیا تو انہوں نے فرمایا:

> ذكر أبو يوسف وأبو حنيفة عند سفيان الثوري فقال: ومن هؤلاء ثم وما هؤلاء(۳۱)
>
> سفیان ثوریؒ کے پاس امام ابو یوسف اور امام ابوحنیفہ کا تذکرہ ہوا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ کون لوگ ہیں، یہ کیا لوگ ہیں۔

یہ روایت سند کے اعتبار سے اس لئے درست نہیں ہے کہ اس روایت کی سند میں ایک راوی عبداللہ بن موسیٰ متکلم فیہ ہیں، ان پر امام احمد بن حنبل، امام عثمان بن ابی شیبہ، امام یعقوب بن سفیان، امام ابومسلم

بغدادی رحمهم الله ودیگر محدثین نے جرح کی ہے، اور خاص جرح اس کی سفیان ثوری سے روایتوں پر ہے، اور یہ روایت بھی اس کی سفیان ثوریؒ سے ہے، اس کے علاوہ یہ راوی نہ صرف شیعہ بلکہ رافضی بھی ہے، ابن سعد اس راوی کے بارے میں لکھتے ہیں:

وكان يتشيع ويروى أحاديث فى التشيع منكرة فضعف بذلك عند كثير من الناس(۳۲)

یہ شیعہ ہے، اور شیعہ مذہب کی تائید میں اس نے بہت سی منکر احادیث روایت کی ہیں، اور اسی وجہ سے یہ اکثر محدثین کے نزدیک ضعیف شمار کیا گیا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جس مصنف کی کتاب سے امام ابو یوسف پر جرح کی یہ روایت منقول ہے یعنی یعقوب بن سفیان کی ''المعرفۃ والتاریخ''، وہ خود اس راوی کے بارے میں کیا کہتے ہیں، ذرا سنتے چلئے:

وقال يعقوب بن سفيان شيعي وإن قال قائل رافضي لم أنكر عليه وهو منكر الحديث(۳۳)

یہ راوی شیعہ ہے اور اگر کوئی اسے رافضی کہے تو بھی مجھے اس قول سے انکار کی گنجائش نہیں ہوگی، اور اس کے علاوہ یہ منکر الحدیث بھی ہے۔

اسی طرح امام ابن حبان، امام ساجی، امام ابن قانع اور دیگر محدثین نے اس کو شیعہ قرار دیا ہے۔

پھر یہ بھی واضح رہے کہ سفیان ثوری کا یہ کلام اولاً تو جرح ہے ہی نہیں، اگر کسی کے بارے میں کہا جائے کہ کون لوگ ہیں کیا لوگ ہیں، تو اس سے نہ اس کی عدالت پر کوئی جرح ہوتی ہے اور نہ ہی حفظ وضبط پر اور انہی دونوں پر کسی راوی پر جرح کا مدار ہے اور جب یہ جرح ہے ہی نہیں تو پھر اس کو جرح کے طور پر پیش کرنا ہی اصولی طور پر غلط اور بے بنیاد بات ہے۔

سفیان بن عیینہؒ

سفیان بن عیینہ ایک حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں:

قال سفيان: مكث أبو يوسف يسألني عن هذا الحديث مدة , فلا أراه أهلا أن أحدثه به حتى كنا عند هارون , فقال له أبو يوسف: يا أمير المؤمنين إن عنده حديثا حسنا فسئله عنه ,

فسألني عنه فحدثته به فسرقه(۳۴)

سفیان بن عیینہ ایک حدیث کے بارے میں کہتے ہیں کہ ابو یوسف ایک مدت تک مجھ سے ایک حدیث کے بارے میں دریافت کرتے رہے، لیکن میں اسے اس کا اہل نہیں سمجھتا تھا، اس لئے اس سے وہ حدیث بیان نہیں کی، ایک دن امیر المومنین ہارون رشید کے دربار میں تھا، کہ ابو یوسف نے ہارون رشید سے کہا کہ ان کے پاس ایک حدیث ہے، آپ ان سے پوچھیں، ہارون رشید نے مجھ سے وہ حدیث دریافت کی تو میں نے ان کو وہ حدیث سنادی، پس اس حدیث کو ابو یوسف نے چرالیا۔

اس جرح کا کئی اعتبار سے جواب دیا جاسکتا ہے:

اولاً: تو سند کے اعتبار سے یہ روایت اس لئے ساقط ہے کہ اس روایت کی سند میں ایک راوی محمد بن عیسی بن نجیح ہے جو ابن الطباع کے نام سے مشہور ہے، یہ راوی تدلیس میں مشہور ہے، اور اس کو امام طحاوی، علائی، ابوزرعہ، ابن العراقی، سیوطی، ذہبی، مقدسی اور امینی نے مدلس قرار دیا ہے۔(۳۵)

اس روایت میں ابن الطباع نے اس قول کو سفیان ثوری سے اس طرح نقل کیا ہے:

قال ابن الطباع: قال سفيان

روایت میں یہ صیغہ ثقہ راوی بھی استعمال کریں تو ان پر بھی اس سلسلے میں شک کیا جاتا ہے، چہ جائیکہ ایک ایسا راوی اس مبہم اور مجہول صیغہ کا استعمال کرے جو تدلیس میں مشہور ہو اور جس کا کام ہی یہ ہے کہ وہ سند میں کمزور شیوخ کے واسطے کو حذف کردے تو ایسے راوی کی اس صیغہ سے روایت تو کسی بھی حال میں قابل تسلیم نہیں کیا ہے۔

اگر یہ روایت بالفرض تسلیم کر بھی لیا جائے تو اس سے ایک گونہ سفیان بن عیینہ پر بھی حرف آتا ہے، کہاں تو وہ امانت و دیانت میں مشہور امام ابو یوسف کو روایت کا اہل نہیں سمجھتے، اور کہاں ایک بادشاہ اور حکمران جس سے بہت ساری کوتاہیاں وابستہ ہیں، اس کو وہ روایت کا اہل سمجھیں، دوسرے یہ بھی ہے کہ اس روایت سے امام ابو یوسف کا شوق علم ابھر کر سامنے آتا ہے کہ ایک ایسی روایت جس کی اہمیت کا مصادر میں کوئی ذکر نہیں ہے، اس تک کیلئے امام ابو یوسف نے ایک لطیف تدبیر اختیار کی، یہ واقعہ امام ابو یوسف کے شوق علم اور ذہانت پر دلیل ہے، اگر کسی کو اس روایت سے استدلال ہی کرنا ہے تو وہ اس سے ان کے شوق علم اور ذہانت وفطانت پر استدلال

کرسکتا ہے۔

ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاریؒ

امام بخاریؒ جرح وتعدیل پر اپنی مشہور کتاب "التاریخ الکبیر" میں امام ابویوسف کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

يعقوب بن إبراهيم أبو يوسف القاضي سمع الشيباني وصاحبه أبو حنيفة تركوه(۳۶)

یعنی محدثین نے ان کوترک کردیا ہے۔

امام بخاری اپنی دوسری تصنیف میں فرماتے ہیں:

تركه يحيى وعبد الرحمن، ووكيع وغيرهم (۳۷)

امام ابویوسف سے روایت کرنا یحییٰ، عبدالرحمن، وکیع اور دیگر محدثین نے ترک کردیا تھا۔

جہاں تک امام بخاری کے پہلے قول کا تعلق ہے تو یہ کئی وجوہ کی بناء پر غلط ہے، اولاً یہ کہ ''ترکوہ'' کا مشارالیہ متعین نہیں ہے، اگر یہ کہا جائے کہ تمام محدثین نے امام ابویوسف سے روایت ترک کردی تھی تو یہ بالبداہت غلط ہے، اگر اکثر مراد ہے تو اکثریت کا تعین ضروری ہوجاتا ہے، ثانیاً یہ جرح غیر مفسر ہے، یعنی ترک کی وجہ مذکورنہیں ہے کہ انہوں نے کس بنیاد پر امام ابویوسف سے روایت کرنا چھوڑ دیا تھا، عدالت میں نقص کی بنیاد پر یا پھر حفظ وضبط کی بنیاد پر، یا پھر کسی اور ایسی بنیاد پر جوان کی نگاہ میں غلط ہو؛ لیکن واقعتاً وہ غلط نہ ہو، جس کی مثالیں کتب جرح وتعدیل میں بکثرت ملتی ہیں کہ ناقد نے کسی سبب کی بنیاد پر راوی پر جرح کیا، اور یہ سبب ایسا تھا جو قابل جرح نہیں تھا، اوراصول حدیث کا قاعدہ ہے کہ جرح غیر مفسر غیر معتبر ہے، بالخصوص ایسے ائمہ جن کی شہرت چہاردانگ عالم میں پھیلی ہوئی ہو اور ایک دنیا نے ان سے فیض اٹھایا ہو، ان کے سلسلے میں جرح غیر مفسر غیر معتبر، ناقابل استدلال اور بے وقعت ہے، اس کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے کہ ہم ماقبل میں ائمہ محدثین کی ایک بڑی تعداد سے امام ابویوسف کی توثیق ثابت کرچکے ہیں، لہذا امام ابویوسف کی صریح توثیق کے بالمقابل جرح غیر مفسر کسی بھی جہت سے قابل استدلال نہیں ہوگی۔

جہاں تک امام بخاری کے دوسرے جرح کی بات ہے، جن میں ترک کرنے والی چند شخصیات کا بیان

ہے تو اس کا جواب بھی حاضر ہے۔

اولاً: اولاً تو یحیی کو متعین کرنے کی ضرورت ہے کہ اس سے ابن معین مراد ہیں، یا پھر ابن قطان، اگر ابن معین مراد ہیں تو ابن معین سے صحت سند کے ساتھ یہ بات ثابت ہے کہ ابن معین امام ابو یوسف کی توثیق کرتے ہیں اور ان سے روایت کرتے ہیں، بالخصوص ابن معین کے آخری شاگرد عباس دوری بھی ابن معین سے امام ابو یوسف کی توثیق نقل کرنے والوں میں سے ہیں؛ لہذا الاعتبار بالخواتیم کے تحت ماقبل کی جروح کا -اگر تسلیم بھی کرلیا جائے کوئی اعتبار نہیں ہوگا۔

ثانیاً: اور اگر ابن قطان مراد ہیں تو امام بخاری کی عظمت شان تسلیم کرنے کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ برقرار رہتی ہے کہ یہ تینوں حضرات جن کا انہوں نے ذکر کیا ہے، ان سے امام بخاری کی ملاقات نہیں ہے، اور امام بخاری نے ان حضرات کے امام ابو یوسف سے روایت ترک کرنے کی سند بیان نہیں کی ہے، جو کہ ضروری امر ہے، یہ بات بھی واضح رہے کہ یہ حضرات عبدالرحمن بن مہدی اور وکیع، امام ابو یوسف کے ہم عصر ہیں اور ظاہر سی بات ہے کہ محدث علو سند کا خواہاں ہوتا ہے اور اپنے ہم عصروں کے بجائے اپنے عالی سند مشائخ سے روایت کرتا ہے؛ لہذا ان حضرات کا امام ابو یوسف سے روایت نہ کرنا اسی علو سند کی خواہش کا اظہار ہے، جیسا کہ خطیب نے بھی امام شافعی کی کسی روایت کو بخاری میں جگہ نہ دینے کا عذر بیان کیا ہے اور ویسے بھی امام ابو یوسف کی وجہ شہرت فقاہت ہے نہ کہ حدیث، اور جو جس فن میں مشہور ہوتا ہے، اس سے لوگ عموماً اسی فن میں رجوع کرتے ہیں، خود امام بخاری کو دیکھئے کہ وہ فقیہ اور محدث دونوں تھے، لیکن ان سے فقہ حاصل کرنے والوں کا کہیں کوئی نام ونشان نہیں ملتا، اور اس سے بھی دلچسپ بات یہ ہے کہ امام بخاری کے اپنے شاگرد امام ترمذی ان کا ذکر بطور فقیہ اور مجتہد اپنی کتاب میں نہیں کرتے، جب کہ اس کے بالمقابل وہ امام احمد، سفیان ثوری، اسحاق بن راہویہ، عبداللہ بن مبارک اور دیگر محدثین کے فقہی مسائل میں نقطہ نظر کا ذکر کرتے ہیں۔

ثالثاً: الضعفاء الصغیر کی امام بخاری کی جانب نسبت اتنی روشن اور واضح نہیں ہے جتنی کہ التاریخ الکبیر، اور یہ امر بھی واضح رہے کہ الضعفاء الصغیر کو امام بخاری سے روایت کرنے والے ایک راوی ابو عبداللہ محمد بن احمد الفارانی کی توثیق کہیں سے دستیاب نہیں ہے۔

رابعاً: کسی محدث کا کسی سے روایت ترک کردینا کوئی جرح نہیں ہے؛ بلکہ یہ ان کا اپنا مزاج، ذوق اور ذاتی پسند وناپسند ہوسکتا ہے، لہذا اس کو معیار نہیں بنایا جاسکتا، امام احمد بن حنبل نے فتنۂ خلق قرآن کے بعد امام یحیی بن معین اور امام علی بن مدینی سے روایت کرنا ترک کردیا تھا، کیا اس کی بنیاد پر ان کو متروک کہا جا

سکتا ہے، خود امام بخاری سے ابوزعہ رازی اور ابوحاتم رازی نے روایت ترک کر دی تھی، کیا اس کی بنیاد پر امام بخاری کو متروک کہنے کی کوئی جرات کرسکتا ہے، اگر جواب نہیں میں ہے اور یقیناً نہیں میں ہی ہونا چاہئے تو پھر اسی اصول کو امام ابو یوسف کے سلسلے میں بھی نافذ کرنا چاہئے؛ کیونکہ الگ الگ پیمانے رکھنے والوں کی اللہ تبارک وتعالی نے مذمت کی ہے، ویل للمطففین۔

امام وکیع بن جراحؒ

وسمعت وكيعا وسأله رجل عن مسألة فقال الرجل: إن أبا يوسف يقول كذا وكذا فحرك رأسه وقال: أما تتقي الله بأبي يوسف تحتج عند الله(۳۸)

یحییٰ بن محمد بن سابق نے کہا کہ میں نے ایک آدمی کو وکیع بن جراح سے مسئلہ پوچھتے ہوئے سنا تو اس آدمی نے کہا کہ ابو یوسف تو اس مسئلہ کے جواب میں آپ سے الگ رائے رکھتے ہیں، وکیع نے (غصے سے) سر کو حرکت دیتے ہوئے اس شخص سے کہا کہ کیا تمہیں خدا کا خوف نہیں ہے، کیا تم اللہ تعالیٰ کے دربار میں ابو یوسف سے حجت پکڑو گے۔

اس قول کی سند میں احمد بن علی الابار ہے، اور امام یزید بن ہارون سے منسوب جرح کے جواب میں حافظ ذہبیؒ کے حوالہ سے یہ بات گزر چکی ہے کہ اس نے ایک موضوع روایت کو نقل کیا ہے؛ لہذا اس کی روایت کا کوئی اعتبار نہیں اور پھر اس قول کا تعلق روایت حدیث سے نہیں ہے؛ بلکہ اجتہادی مسائل سے ہے اور اجتہادی مسائل میں ایک دوسرے کی تغلیط عام سی بات ہے، اور اس کو اسلامی نصح و ہمدردی کا حصہ سمجھا گیا ہے، اس کی بنیاد پر نہ کسی کی عدالت میں کمی واقع ہوتی ہے اور نہ حفظ وضبط پر کوئی اثر پڑتا ہے، جہاں تک امام وکیع کے قول کے اس حصے کا تعلق ہے کہ

''کیا تو ابو یوسف کے قول سے اللہ کے سامنے حجت پکڑے گا''۔

تو اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ امام ابو یوسف کو حدیث نہ پہنچی ہو اور انہوں نے ادلہ شرعیہ میں غور کر کے اپنا نقطہ نظر بیان کیا ہو، اور حدیث اس کے برخلاف ہو، اس بنیاد پر امام وکیع کو غصہ آیا ہو، ورنہ تو ایک عامی کا کام یہی ہے کہ وہ مجتہد سے شرعی مسئلہ دریافت کرے اور اس پر عمل کرے، اور اس میں کچھ بھول چوک ہوتی ہے تو

بھی عامی بری الذمہ ہے۔

ابو زرعہ رازیؒ:

ابوزرعہ رازی سے منسوب کتاب ''اسامی الضعفاء'' میں امام ابو یوسفؒ کا تذکرہ ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ امام ابوزرعہ رازی کے نزدیک امام ابو یوسف ضعیف راوی ہیں۔

اس جرح کا جواب یہ ہے کہ امام ابوزرعہ رازی سے منسوب کتاب ''اسامی الضعفاء'' کو ان سے نقل کرنے والے ابوعثمان برزعی (م: ۲۹۲ھ) ہیں، اورانہوں نے اس کتاب کے شروع میں تصریح کردی ہے کہ:

فنسخت هذه الأسامي من كتابه الذي ناولني من يده بخطه ولم أسمعه منه(۳۹)

میں نے ان ضعفاء کے ناموں کو ابوزرعہ کی لکھی ہوئی تحریر سے نقل کیا ہے، ان سے براہ راست سنا نہیں ہے۔

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اس کتاب کے ناقل کو نہ امام ابوزرعہ سے سماع حاصل ہے اور نہ ہی معلوم ہے کہ ان کو اس کتاب کی روایت کرنے کی اجازت امام ابوزرعہ سے حاصل ہے یا نہیں، غیر مقلد عالم زبیر علی زئی نے بھی شیخ احمد شاکر کے حوالہ سے لکھا ہے کہ راوی کی روایت کے معتبر ہونے کیلئے ضروری ہے کہ اس کا سماع اپنے استاذ سے ہو اور وہ ناقابل اعتماد نسخہ سے روایت نہ کرتا ہو، علاوہ ازیں زبیر علی زئی نے مصنف عبدالرزاق جیسی شہرہ آفاق کتاب کے استناد پر محض اس لئے شک وشبہ کا اظہار کیا ہے کہ اس کتاب کو عبدالرزاق سے نقل کرنے والے راوی نے اپنی کم عمری میں مصنف عبدالرزاق سے اس کا سماع کیا تھا۔(۴۰) پھر جب کہ یہاں برزعی کا ابوزرعہ سے سرے سے سماع ہی نہیں ہے تو پھر اس کے استناد پر کتنے شکوک وشبہات ہوسکتے ہیں، اس کا اندازہ مشکل نہیں۔

ثانیاً: اگر اس کتاب کی نسبت امام ابوزرعہ کی جانب صحیح مان لی جائے، اور یہ بھی مان لیا جائے کہ اس میں امام ابو یوسف کو ضعیف قرار دیا گیا ہے تو بھی یہ بات امام ابو یوسف کو ضعیف قرار دینے کیلئے کافی نہیں ہوگی؛ کیونکہ کسی راوی کو صرف ضعیف کہنا جرح مبہم ہے اور جرح مبہم غیر معتبر ہوتی ہے، بالخصوص ان کے حق میں جن کی ائمہ حدیث نے صراحتاً توثیق کی ہو، کیونکہ مبہم جرح سے ہمیں یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ ضعف کی وجہ کیا ہے، امام ابو یوسف کی عدالت میں کوئی نقص ہے، یا پھر ان کے حفظ وضبط پر شک ہے یا پھر ان کے دربار عباسی سے وابستہ

ہونے کو اس میں دخل ہے، جب تک صراحتاً کچھ جرح کی وجہ معلوم نہ ہو، محض گمان اور قیاس سے کسی کو ضعیف نہیں قرار دیا جاسکتا۔

امام ابوحاتم رازیؒ

امام ابوحاتم رازی بلند پایہ ناقد رجال ہیں، آپ امام ابویوسف کے بارے میں فرماتے ہیں:

يكتب حديثه وهو أحب إلى من الحسن اللؤلؤى(۴۱)

ان کی حدیث لکھی جائے گی اور وہ مجھ کو حسن لولوئی سے زیادہ پسند ہیں۔

اس جرح کا جواب یہ ہے کہ امام ابوحاتم کا کسی راوی کے متعلق "يكتب حديثه" کہنا اس راوی کی توثیق کی دلیل ہے، جیسا کہ کتب اصول حدیث میں جرح کے الفاظ کے باب میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ

امام احمد بن حنبلؒ کا علمی وفقہی مقام اور حدیث میں ان کی گہرائی وگیرائی محتاج بیان نہیں، وہ امام ابویوسف کے تعلق سے فرماتے ہیں:

صدوق ولكن من أصحاب أبي حنيفة لا ينبغي ان يروى عنه شئ(۴۲)

سچے ہیں، لیکن ابوحنیفہ کے شاگردوں میں سے ہیں اور ابوحنیفہ کے شاگردوں سے کچھ بھی روایت کرنا مناسب نہیں ہے۔

ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

وأنا لا أحدث عنه(۴۳)

میں ابویوسف سے روایت نہیں کرتا ہوں۔

پہلی جرح کا جواب یہ ہے کہ جب امام احمد بن حنبل خود ہی ان کو صدوق کہہ رہے ہیں تو گویا ان کو روایت حدیث کیلئے اہلیت کا تمغہ عطا کر رہے ہیں اور جہاں تک امام ابوحنیفہ کے شاگردوں سے روایت نہ کرنے کی بات ہے تو یہ ان کا ذاتی ذوق اور مزاج ومذاق ہے، جس کا اصول حدیث اور معیار قبولیت ورد سے کوئی لینا دینا نہیں ہے، ایک شخص کو کوئی ایک راوی ناپسند ہے اور وہ اس سے روایت نہیں کرتا ہے تو یہ اس کی افتاد طبع ہے، کسی کی پسند ناپسند پر کوئی راوی مقبول اور مردود نہیں ہوتا ہے، مقبول اور مردود ہونے کیلئے علمی اصول اور معیار ہیں،

جوان معیارات پر پورا اترے گا، وہ روایت کا اہل ہوگا، اور جوان معیارات پر ناقص ثابت ہوگا، وہ روایت حدیث میں نااہل ہوگا، لہذا امام احمد بن حنبل کی یہ جرح، جرح نہیں ہے، بلکہ امام ابو یوسف کے حق میں تمغہ فضیلت ہے، جس کا اظہار انہوں نے ''صدوق'' کہہ کر کیا ہے۔

اور جہاں تک دوسری جرح کی بات ہے تو یہ بھی اسی افتادطبع کا اظہار ہے کہ وہ ان سے روایت نہیں کرتے، روایت نہ کرنے کی وجہ کیا ہے، تو امام احمد کے قول سے بھی واضح ہوگیا کہ اس کی وجہ عدالت میں نقص یا حفظ وضبط میں کمی نہیں ہے، بلکہ امام ابوحنیفہ کی شاگردی ہے، اور امام ابوحنیفہ کی شاگردی روایت حدیث میں کوئی عیب نہیں ہے، لہذا یہ وجہ بھی نا قابل تسلیم ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ امام احمد بن حنبل کا امام ابو یوسف سے روایت کرنا ثابت ہے، ایک تو ان کا وہ اعتراف ماقبل میں نقل ہو چکا ہے جس میں انہوں نے تین بڑے تھیلے کے مقدار علم حاصل کرنے کی بات کہی ہے، دوسرے امام احمد خود کہہ چکے ہیں کہ امام ابو یوسف روایت وآثار میں منصف مزاج تھے، اور بعض محققین کا یہ بھی کہنا ہے کہ امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں بھی امام ابو یوسف سے روایت کی ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ امام احمد بن حنبل نے امام ابو یوسف کی عدالت اور حفظ وضبط پر کوئی کلام نہیں کیا ہے، بلکہ صدوق وغیرہ کہہ کر واضح کر دیا ہے کہ ان میں عدالت اور حفظ وضبط دونوں موجود ہیں، ہاں اصول حدیث کے معیارات سے ہٹ کر دیگر خارجی اسباب اور تاثرات کی بنا پر اگر وہ روایت کرنے کے روادار نہ ہوں تو اس سے راوی مجروح نہیں ہوتا۔

قاضی شریک نخعی

یحییٰ بن آدم جو بلند مرتبت محدث اور فقیہ تھے، فرماتے ہیں:

> ابو یوسف نے قاضی شریک کے سامنے کسی معاملے میں گواہی دی تو قاضی شریک نے امام ابو یوسفؒ کی گواہی کو رد کر دیا، میں نے کہا کہ آپ نے ابو یوسف (جیسے بلند مرتبہ شخصیت) کی گواہی رد کر دی تو قاضی شریک نے جواب دیا کہ میں ایسے شخص کی گواہی کیوں نہ رد کردوں جو نماز کو ایمان میں سے نہ سمجھے۔ (۴۴)

اس جرح کا جواب یہ ہے کہ اولاً تو قاضی شریک بذات خود مختلف فیہ ہیں اور متعدد ناقدین رجال نے ان کی تضعیف کی ہے، دوسرے یہ ہے کہ اس جرح میں عدالت اور حفظ وضبط پر کوئی بات نہیں کی گئی ہے، بلکہ

ایمانیات کے ایک فروعی مسئلہ کہ اعمال ایمان کا جزء ہیں یا نہیں، اس پر بات کی گئی ہے اور یہ صرف امام ابو یوسف نہیں، بلکہ جمہور متکلمین کا مسلک یہی ہے کہ اعمال ایمان کا جزء نہیں ہیں، اس طرح کے مسائل میں اختلاف اور رد وتنقید کی وجہ سے کوئی مجروح نہیں ہوجاتا، اور نہ کسی کی عدالت ودیانت میں کوئی نقص واقع ہوتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے مسائل کو جرح شمار کرنا ہی ایک اصولی اور علمی بددیانتی ہے، جس کا ارتکاب دورحاضر میں کچھ لوگ کرتے ہیں۔

عمرو بن علی الفلاسؒ

مشہور ناقدرجال عمرو بن علی الفلاس کہتے ہیں:

أبو يوسف صدوق كثير الغلط (۱)

ابو یوسف سچے ہیں، لیکن ان سے بکثرت غلطیاں واقع ہوتی ہیں۔

اس جرح کا جواب یہ ہے کہ حافظ فلاس نقد رجال میں متشدد اور متعنت ہیں، یہاں تک کہ صحیح بخاری کے کئی روات بھی ان کے نقد کے نشتر سے نہیں بچ سکے ہیں، حافظ ابن حجر بخاری کے ایک راوی پر فلاس کی جرح کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

تكلم فيه الفلاس فلم يلتفت إليه (۴۶)

ان پر فلاس نے جرح کیا ہے؛ لیکن کسی نے فلاس کی جرح کو اہمیت نہیں دی ہے۔

لہذا ان کا امام ابو یوسف پر جرح کرنا قابل اعتبار نہیں ہے؛ کیونکہ اصول حدیث میں یہ قاعدہ مقرر ہے کہ اگر متشدد ناقد رجال جرح کرے تو اس کی بات فوراً تسلیم نہیں کی جائے گی؛ بلکہ دیگر ائمہ جرح وتعدیل کے بیانات کو بھی دیکھا جائے گا اور اگر معتدل ائمہ کرام کے بیانات اس کے معارض ہوں تو معتدل ائمہ کرام کے نقد کو ترجیح دی جائے گی، اور ماقبل میں ائمہ حدیث کے بیانات گزر چکے ہیں، جس میں انہوں نے امام ابو یوسف کی توثیق کی ہے۔

امام دارقطنیؒ

امام دارقطنی امام ابو یوسفؒ کے بارے میں فرماتے ہیں:

سئل عن أبي يوسف القاضي فقال: أعور بين عميان (۴۷)

امام دارقطنی سے امام ابو یوسف کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ ان کا

مقام اندھوں میں کانے کی طرح ہے۔

اس جرح کا جواب دیتے ہوئے مولانا عبید اختر رحمانی لکھتے ہیں:

"اعور بین عمیان" والے جملے کا پس منظر بڑا واضح ہے، خطیب بغدادی اس جملہ کے ایک چشم دید گواہ یعنی امام صیمری کا بیان نقل کرتے ہیں:

> حضرت عند أبي الحسن الدارقطني وسمعت منه أجزاء من كتاب السنن الذي صنفه قال: فقرء عليه حديث غورك السعدي عن جعفر بن محمد، الحديث المسند في زكاة الخيل، وفي الكتاب غورك ضعيف، فقال أبو الحسن: ومن دون غورك ضعفا؟ فقيل الذي رواه عن غورك هو أبو يوسف القاضي فقال: أعور بين عميان! وكان أبو حامد الإسفرايينی حاضرا فقال: ألحقوا هذا الكلام في الكتاب! قال الصيمري: فكان ذلك سبب انصرافي عن المجلس ولم أعد إلى أبي الحسن بعدها، ثم قال: ليتني لم أفعل، وأيش ضر أبا الحسن انصرافي؟! أو كما قال(۴۸)

اقتباس میں واضح ہے کہ ایک سند پر جب امام دارقطنی نے کلام کیا کہ اس کی سند ضعیف ہے تو کسی نے پوچھا کہ اس سند میں تو امام ابو یوسف بھی ہیں تو فرمایا: اعور بین عمیان، یعنی اس جملہ کا تعلق غورک اور اس سند کے دیگر روات سے ہے، نہ کہ امام محمد بن الحسن اور دیگر ائمہ احناف سے، اور اسی مفہوم کی تائید امام دارقطنی کے حیات وخدمات پر کتاب لکھنے والے مشہور عرب عالم عبداللہ بن ضیف الرحیلی نے کی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

> والدار قطني إنما تكلم فيه عند ما جاء في سند حديث بين ضعفاء، وهذا السند هو: "محمد بن موسى الحارثي، عن إسماعيل بن يحيى بن بحر الكرماني، عن الليث بن حماد الاصطخري، عن أبي يوسف، عن غورك فلما أخبر الدارقطني عن ضعف غورك ومن دونه قيل له: إن فيهم أبا يوسف فقال: "أعور بين عميان" يريد

أن أبا يوسف وإن كان فيه ضعف ما، فهو أحسن حالا من غورك، والليث بن حماد، ومن معهما في السند من الضعفاء(۴۹)

واضح رہے کہ غورک کوخود دارقطنی نے ضعیف جدا کہا ہے، دیکھئے:

غورك السعدي.عن جعفر بن محمد.قال الدارقطني: ضعيف جدا.

أنبأنا الفخر علي، أنبأنا منصور وجماعة، عن جماعة سمعوه من البيهقي، أنبأنا ابن عبدان، حدثنا أبي، حدثنا محمد بن موسى الاصطخري، حدثنا إسماعيل بن يحيى الأزدي، حدثنا الليث بن حماد، حدثنا أبو يوسف، عن غورك بن الحضرمي، عن جعفر بن محمد، عن أبيه، عن جابر، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: في الخيل السائمة في كل فرس دينار.وضعف الدارقطني الليث وغيره في إسناده(۵۰)

اس بحث سے یہ بات واضح ہے کہ اعور بین عمیان کاتعلق ایک مخصوص سند سے ہے،جس میں کئی بہت زیادہ ضعیف روات موجود تھیں،اس سند میں جب امام ابو یوسف کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا کہ ان کی مثال اس سند میں ایسی ہے جیسے اندھوں میں کانے کی،اور دیکھا جائے تو درحقیقت اس جملہ سے بھی دارقطنی نے امام ابو یوسف کی توثیق کی ہے کہ انہوں نے دیگر زیادہ ضعیف روات کے بالمقابل اس تعبیر کے استعمال سے ثقہ قرار دیا ہے۔(النصر الربانی فی الرد علی محمد بن الحسن الشیبانی کا تنقیدی جائزہ)

محمد بن سعد کاتب الواقدیؒ

محمد بن سعد جو ابن سعد کے نام سے مشہور ہیں،وہ امام ابو یوسف کے بارے میں فرماتے ہیں:

ثم لزم أبا حنيفة النعمان بن ثابت فتفقه وغلب عليه الرأي وجفا الحديث(۵۱)

حقیقت یہ ہے کہ یہاں پر ابن سعد نے تعبیر میں غلطی کی ہے،تفقہ کی جانب توجہ کا مطلب حدیث سے دوری اور اس پر ظلم نہیں، بلکہ حدیث کے مقصد اصلی کی جانب متوجہ ہونا ہے،ورنہ محض حدیث کے جمع وتلاش

میں مصروف رہنے کی بہت سے اکابر محدثین نے مذمت کی ہے، اور تاکید کی ہے کہ حدیث کا اصل مقصد اس میں درج معانی واحکام کو سمجھنا ہے، یہی وجہ ہے کہ جولوگ صرف حدیث کے واقف کار ہیں، فقہ سے ان کو مس نہیں، ان کو ناقص اور ادھورا سمجھا گیا ہے، اور اسی کی تاکید کرتے ہوئے مشہور فقیہ امام ابوثور نے مشہور محدث اور ناقد رجال ابوزرعہ رازی کو خط لکھ کر فقہ کے حصول کی جانب توجہ دلائی تھی، چنانچہ ابوحاتم رازی ابوزرعہ رازی سے نقل کرتے ہیں:

أبا زرعة يقول كتب إلى أبو ثور فقال فى كتابه: كان الأمر قديما أمر أصحابك يعنى فى التفقه حتى نشأ قوم فاشتغلوا بعدد الأحاديث وتركوا التفقه. قال وسمعت أبا زرعة يقول: وقد عاد فى التفقه وهو الأصل(۵۲)

ابوزرعہ کہتے ہیں کہ مجھ کو ابوثور نے خط لکھا اور اس میں یہ لکھا کہ قدیم محدثین کا طرز عمل یہ تھا کہ وہ حدیث کے ساتھ فقہ کی جانب بھی پوری توجہ دیتے تھے، مگر محدثین کی نئی پود کا طرز عمل یہ ہے کہ انہوں نے صرف حدیث کے جمع وتفتیش کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے، فقہ کی جانب کوئی توجہ نہیں ہے، میں نے ابوزرعہ سے سنا کہ وہ کہہ رہے تھے کہ اب کچھ لوگوں نے پھر سے حدیث کے ساتھ فقہ کی جانب توجہ کی ہے اور یہ اصل چیز ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ فقہ اور حدیث ایک دوسرے کی تکمیل ہیں، ایک دوسرے کے مخالف نہیں ہیں؛ یہی وجہ ہے کہ ماضی بعید سے لے کر اب تک ہر زمانے میں اہل علم نے خطابی سے لے کر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی تک اس جانب توجہ دلائی ہے کہ رائے اور حدیث دونوں کی جانب توجہ ضروری ہے اور یہ دونوں مل کر ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں، اگر ایک اصل بنیاد ہے تو دوسرا اس کی چھت اور کھڑکیاں ہیں، اگر صرف زمین ہو اور اس پر کوئی تعمیر نہ ہو تو اس کا کیا فائدہ اور اگر زمین ہی نہ ہو تو اس پر تعمیر کس چیز کی ہوگی۔

بعض ناقد رجال نے رائے کو بھی جرح کے اسباب میں شمار کرلیا ہے، یہ ان کی غلطی بلکہ غلط فہمی ہے کیونکہ انہوں نے یہ سمجھا ہے کہ جولوگ رائے کا استعمال کرتے ہیں، وہ لوگ رائے کو حدیث پر مقدم کرتے ہیں، جب کہ بات اس کے برعکس ہے، اور اگر رائے کو موجب جرح مانا جائے تو پھر امام مالک کے استاذ ربیعۃ الرائے کے بارے میں کیا کہا جائے گا، جن کی وجہ شہرت ہی رائے سے ہے اور جن کی فقہی آراء سے امام مالک کی مشہور عالم کتاب موطا بھری ہوئی ہے۔

یہ بات بھی واضح رہنی چاہئے کہ ابن سعد واقدی کے شاگرد ہیں اور واقدی اہل کوفہ سے منحرف تھے، کوفہ والوں کو پسند نہیں کرتے تھے اور ابن سعد زیادہ تر واقدی کی تضعیف وغیرہ پر اعتماد کرتے ہیں، اور واقدی نہایت ضعیف راوی ہیں، لہذا ان اسباب کی بناء پر ابن سعد کی یہ جرح موجب التفات اور قابل توجہ نہیں ہے۔

حوالہ جات:

(۱) الکامل فی ضعفاء الرجال، أبو یوسف القاضی أنصاری:۸/۴۶۶، رقم الترجمة: ۲۰۵۵

(۲) سیر أعلام النبلاء، علان علی بن أحمد بن سلیمان المصری:۱۴/۴۹۶، رقم الترجمة:۲۷۹

(۳) تاریخ بغداد، أیوب بن إسحاق بن إبراهیم بن سافری أبو سلیمان:۷/۴۵۸، رقم الترجمة:۳۴۲۵

(۴) التنکیل بما فی تأنیب الکوثری من الأباطیل، القسم الثانی فی التراجم:۱/۳۰۵

(۵) المعرفة والتاریخ، باب ما جاء فی الکوفة:۲/۷۸۹

(۶) الضعفاء الکبیر للعقیلی، أبو یوسف القاضی:۴/۴۳۸، رقم الترجمة:۲۰۷۱

(۷) الضعفاء الکبیر للعقیلی، أبو یوسف القاضی:۴/۴۳۸، رقم الترجمة:۲۰۷۱

(۸) سیر أعلام النبلاء، ابن درستویه عبد الله بن جعفر الفارسی:۱۵/۵۳۱، رقم الترجمة:۳۰۹

(۹) خیر الکلام از حافظ محمد صاحب گوندلوی، ص:۳۰۶

(۱۰) میزان الاعتدال فی نقد الرجال، حرف العین، علی بن عبد الله بن جعفر، أبو الحسن الحافظ:۳/۱۴۰، رقم الترجمة:۵۸۷۴

(۱۱) لسان المیزان، حرف الهاء، من اسمه الهیثم:۶/۲۰۶، رقم الترجمة:۷۳۳

(۱۲) لسان المیزان، حرف الهاء، من اسمه الهیثم:۶/۲۰۶، رقم الترجمة:۷۳۳

(۱۳) تاریخ بغداد، الهیثم بن خلف:۱۶/۹۱، رقم الترجمة:۷۳۵۱

(۱۴) نور العینین فی اثبات رفع الیدین از حافظ زبیر علی زئی، ص:۲۰

(۱۵) لسان المیزان، حرف الألف، من اسمه أحمد:۱/۱۴۷، رقم الترجمة:۴۶۸

(۱۶) التنکیل بما فی تأنیب الکوثری من الأباطیل، القسم الثانی فی التراجم:۲/۷۱۵

(۱۷) الضعفاء الکبیر للعقیلی، أبو یوسف القاضی:۴/۴۳۸، رقم الترجمة:۲۰۷۱

(١٨) الضعفاء الكبير للعقيلي،أبو يوسف القاضي:٣٣٨/٤،رقم الترجمة:٢٠٧١

(١٩) سير أعلام النبلاء، الطبقة التاسعة، عبد الله بن إدريس بن يزيد بن عبد الرحمن الأودي: ٤٣/٩، رقم الترجمة: ١٢

(٢٠) سير أعلام النبلاء، الطبقة التاسعة، عبد الله بن إدريس بن يزيد بن عبد الرحمن الأودي: ٤٨/٩، رقم الترجمة: ١٢

(٢١) سير أعلام النبلاء، الطبقة التاسعة، عبد الله بن إدريس بن يزيد بن عبد الرحمن الأودي: ٤٨/٩، رقم الترجمة: ١٢

(٢٢) *توضیح الکلام ازارشادالحق اثری*:١/ ٢٣٨

(٢٣) سير أعلام النبلاء، الطبقة التاسعة، عبد الله بن إدريس بن يزيد بن عبد الرحمن الأودي: ٤٨/٩، رقم الترجمة: ١٢

(٢٤) تاريخ بغداد، محمد بن الحسن بن فرقد، أبو عبد الله الشيباني: ١٧٨/٢، رقم الترجمة: ٥٩٣

(٢٥) الضعفاء الكبير للعقيلي،يعقوب بن إبراهيم أبو يوسف القاضي:٤٣٨/٤، رقم الترجمة : ٢٠٧١

(٢٦) ميزان الاعتدال في نقد الرجال،أحمد بن علي الخيوطي: ١٢١/١، رقم الترجمة: ٤٨٠

(٢٧) لسان الميزان، حرف الياء، من اسمه يعقوب: ٣٠٠/٦، رقم الترجمة: ١٠٨١

(٢٨) تاريخ بغداد، أبو يوسف القاضي: ٢٥٦/١٤، رقم الترجمة: ٧٥٥٨

(٢٩) الضعفاء الكبير للعقيلي، أبو يوسف القاضي:٤٣٨/٤،رقم الترجمة:٢٠٧١

(٣٠) *توضیح الکلام ازارشادالحق اثری*:١/ ٢٦٧

(٣١) المعرفة والتاريخ،باب ما جاء في الكوفة:٧٩١/٢

(٣٢) الطبقات الكبرى لإبن سعد،الطبقة السابعة: ٣٦٨/٦، رقم الترجمة: ٢٧٤٨

(٣٣) تهذيب التهذيب لإبن حجر العسقلاني، من اسمه عبيد الله مصغرا: ٥٣/٧، رقم الترجمة: ٩٧

(٣٤) الضعفاء الكبير للعقيلي، باب الياء، أبو يوسف القاضي:٤٣٨/٤،رقم الترجمة:٢٠٧١

(٣٥) تهذيب الكمال في أسماء الرجال، باب الميم، محمد بن عيسى بن نجيح البغدادي ابن

الطباع: ۳/۳۰۲، رقم الترجمة: ۵۵۳۴

(۳۶) التاریخ الکبیر للبخاری،أبو یوسف القاضی: ۸/۳۹۷، رقم الترجمة: ۳۴۶۳

(۳۷) کتاب الضعفاء للبخاری، أبو یوسف القاضی، ص: ۱۴۳-۱۴۲، رقم الترجمة: ۴۳۶

(۳۸) الضعفاء الکبیر للعقیلی، بأبو یوسف القاضی:۴/۴۳۸،رقم الترجمة:۲۰۷۱

(۳۹) أسامی الضعفاء لأبی زرعة الرازی، ص: ۳۰۷

(۴۰) تعداد رکعات قیام رمضان، ص: ۶۹

(۴۱) الجرح والتعدیل لابن أبی حاتم الرازی، باب الیاء، یعقوب: ۹/۲۰۲، رقم الترجمة: ۸۴۱

(۴۲) الجرح والتعدیل لابن أبی حاتم الرازی، باب الیاء، یعقوب: ۹/۲۰۱، رقم الترجمة: ۸۴۱

(۴۳) تاریخ بغداد، یعقوب بن إبراهیم، أبو یوسف القاضی: ۱۴/۲۶۱، رقم الترجمة: ۷۵۵۸

(۴۴) الضعفاء الکبیر للعقیلی، أبو یوسف القاضی :۴/۴۳۸، رقم الترجمة:۲۰۷۱

(۴۵) تاریخ بغداد، یعقوب بن إبراهیم، أبو یوسف القاضی: ۱۴/۲۶۲، رقم الترجمة: ۷۵۵۸

(۴۶) هدی الساری مقدمة فتح الباری، فصل فی أسباب تمییز الطعن فی المذکورین، ص: ۴۸۷

(۴۷) تاریخ بغداد، ذکر من اسمه یعقوب، یعقوب بن إبراهیم، أبو یوسف القاضی: ۱۴/۲۶۲، رقم الترجمة: ۷۵۵۸

(۴۸) تاریخ بغداد، حرف العین، أبو عبدالله القاضی الصیمری: ۸/۷۸، رقم الترجمة: ۴۱۶۳

(۴۹) الإمام أبو الحسن الدارقطنی وآثاره العلمیة، أقوال الأئمة، ص: ۱۱۲

(۵۰) میزان الاعتدال فی نقد الرجال، حرف الغین، غورك السعدی: ۳/۳۳۷، رقم الترجمة: ۴۸۰

(۵۱) الطبقات الکبری لابن سعد، المدائن، أبو یوسف القاضی: ۷/۲۳۹، رقم الترجمة: ۳۴۸۵

(۵۲) الجرح والتعدیل لابن أبی حاتم الرازی، باب ما ذکر من جلالة أبی زرعة عند العلماء: ۱/۳۴۴، رقم الترجمة: ۸۴۱

○○○

حضرت مولانا عبدالصمد رحمانیؒ
آسمان علم وفقہ کا درخشندہ ستارہ

مولانا محمد غالب شمس قاسمی ❖

کچھ شخصیتیں لازوال ہوتی ہیں، وہ تاریخ کے صفحات میں گم نہیں ہوا کرتیں، ان کے کارنامے زندہ ہوتے ہیں، وہ لاکھوں تشنگان علوم کی علمی سیرابی کا ذریعہ ہوتی ہیں، ایسی ہی ایک شخصیت مولانا عبدالصمد رحمانی کی تھی، وہ ایک وسیع النظر فقیہ، عظیم المرتبت محقق، عہدوں سے بیزار، قوم کے محسن، متعدد علمی تصانیف کے مصنف، معقولات کے امام، احقاق حق، ابطال باطل جس کا شیوہ، خانقاہ رحمانیاورامارت شرعیہ کی ترقی میں جن کا لہو شامل ہے، امارت شرعیہ ان کی خدمات اور کارناموں کی گواہ ہے، اس کی علمی، فکری سرمائے کا جو جامع ہے، جس کی دریافت میں علم وتحقیق اور فقہ وقضا کے بہت اہم مضامین شامل ہیں، جن کی کتابوں میں اجتہادی شان اور تفہیمی بلند پروازی ہے، فکر ونظر کے نئے اکتشافات اور قرآنی ترجمانی ہوتی ہے، جس نے ابوالمحاسن محمد سجاد کے نظریۂ امارت کو نئی وسعتوں سے ہم کنار کیا، جس کی "قرآن محکم" اجتہادی اور ولی اللہی فکر کی تکمیل ہے، جو "ہندوستان اور مسئلہ امارت" حضرت ابوالمحاسن محمد سجاد کی دیرینہ خواہش، ابوالکلام آزاد کے خواب پریشاں کی حسیں تعبیر اور مخالفین کے آرزؤں کی تشریح ہے، جس کا اسم بامسمی ہے، جو یکتائے روزگار ہے، جو باطل کے خلاف آہنی تلوار ہے، جس نے پوری عمر بے نیازی سے گزار دی، جس کا وطیرہ تھا "گوشے میں قفس کے آرام بہت ہے"۔ جو کسی کے لئے نائب صاحب، اور ناظم صاحب تھا، اور قوم کے درمیان مغتنم العلماء بقیۃ السلف حضرت مولانا عبدالصمد رحمانی کے نام سے جانے پہچانے جاتے تھے۔

❖ امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ، بہار

آپ امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کے دوسرے نائب امیر شریعت، امارت کے ناظم اور مفتی، قطب عالم حضرت مولانا محمد علی مونگیری کے مسترشد، حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کے شاگرد رشید، اور ان کی زندگی بھر کے رفیق تھے، آپ جمعیۃ علماء ہند کے نائب ناظم اور مسلم انڈپنڈنٹ پارٹی کے نگران عام اور دارالعلوم دیوبند کے رکن شوری تھے، آپ کو قرآن وحدیث سے بے حد شغف، امارت شرعیہ سے فکری وجذباتی وابستگی، اس سے والہانہ عشق اور تہذیبی وسیاسی تاریخ سے غیر معمولی لگاؤ تھا، علامہ سید سلیمان ندوی کی زبان میں "فقہی مسائل میں بصیرت رکھتے ہیں، اور تفقہ فی الدین کی دولت خداداد سے بھی سرفراز ہیں"، (ہندوستان اور مسئلہ امارت۔:) آپ نے علمی تحقیق اور اسلامی علوم میں کارہائے نمایاں انجام دیے، علمی تحریکات کے ذریعہ ملت اسلامیہ کی گراں قدر خدمات انجام دیں اور اکابر علماء کے ہمراہ آزادی ہند کی جنگ میں شریک رہے۔ بقول شاہد رام نگری: "آپ کی زندگی علم اور سیاست کا ایک شاندار مرقع تھی، اور آپ کی شخصیت جامع کمالات تھی"۔ (نقیب 17 ربیع الثانی 1393ھ مطابق۔ 21 مئی 1973ء)

سیرت کی پختگی، کردار کی استقامت، علم وفضل کی وسعت، جمعیۃ علماء ہند، مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی جیسی بڑی تنظیموں سے انسلاک وارتباط کی بناء پر آپ کی خدمات حد درجہ متنوع ہیں، آپ کی شخصیت فقید المثال اور نادر روزگار تھی، آپ کی کتابیں دراصل امارت کی روح ہیں، افکار ابوالمحاسن محمد سجاد کی آئینہ دار ہیں، آپ کی کتابیں پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ اپنی ذات میں انجمن تھے، قادیانیت، اور آریہ سماج کی رد میں لکھی گئی آپ کی کتابیں علمی وتحقیقی شاہکار ہیں، علمی گہرائی وگیرائی، اور وسعت فکر ونظر کا اندازہ لگانا ہو تو مولانا کی تحقیقی، تصنیفی اور علمی کارناموں کو پڑھیے، تنہا آپ بے حساب علمی شخصیات کے برابر کام کر گئے، اور آپ اپنی انہیں کتابوں اور تحریروں کے ذریعے آج بھی زندہ وتابندہ ہیں، آپ کے بارے میں حکیم الاسلام قاری محمد طیب قاسمی مہتمم دارالعلوم دیوبند کی بات حرف بہ حرف سچی ہے کہ: "حضرت مولانا عبدالصمد رحمانی نائب امیر شریعت بہار، ورکن مجلسِ شوریٰ دارالعلوم دیوبند کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں، مولانا ممدوح کا علمی فضل وکمال، عالمانہ رخ، اور انتھک علمی خدمات علمی حلقوں میں مسلم ہے، ان کے تعارف کے لئے خود انہی کی علمی شہادتیں کافی ہیں، جو انہیں علمی ذہنوں میں متعارف بناتی رہی ہیں، اور بناتی رہیں گی، کسی بیرونی قلم کو کبھی بھی اس تکلیف وتکلف کی ضرورت نہ ہوگی، کہ وہ ان کے تعارف کے لئے کاغذ پر سرنگوں ہو"۔ (قرآن محکم ص 1)

یہی وجہ ہے کہ ماہ وسال کے تھپیڑوں اور تاریخ کی بے رحمانہ بے التفاتی کے باوجود آپ کی شخصیت

اب بھی علمی حلقوں میں جگمگا رہی ہے،اوراپنا فیض پہنچارہی ہے۔

المیہ یہ ہے کہ ایسی نابغہ روزگار شخصیت، ہندوستان گیر شہرت یافتہ فقیہ ومحقق،اورقوم کے محسن ومربی کی وفات پر پانچ دہائی گذرنے کے بعد بھی ان کی سوانح حیات وعلمی خدمات کے جائزے پر اب تک مستقل کتاب نہیں آسکی، یہ حق تو امارت وخانقاہ رحمانی کا ہے کہ ان کی زندگی پر سیمینار کرائے، اور کماحقہ ان کو خراج عقیدت پیش کرے، میری نظر میں یہ فرض بھی ہے،اور قرض بھی، حسب کی ادائیگی ابھی باقی ہے۔

شہر باڑھ:

گنگا کے جنوبی کنارے پر واقع قصبہ باڑھ تاریخی اہمیت کا حامل رہا ہے،مغل اور برطانوی دور میں باڑھ پٹنہ کا ایک بڑا تجارتی شہر تھا،اور یہ پٹنہ وکولکاتا کے درمیان تجارتی مرکز اور گزرگاہ کی حیثیت اختیار کر گیا تھا، اسی شہر میں محمد علی وردی خان نے مراٹھوں کو شکست دی،سکندر لودی نے بنگال کی طرف پیش قدمی کی،اور معاہدہ میں طے ہوا کہ باڑھ کا مشرقی علاقہ بنگال کے حکمران کے زیر نگیں ہوگا، جب کہ مغرب کا علاقہ دہلی سلطنت کے زیر تسلط ہوگا۔

یہ پٹنہ شہر سے ستر کلومیٹر کے فاصلے پر اور بیگوسرائے سے متصل واقع ہے،اسی شہر باڑھ سے ساڑھے چار کلومیٹر دور ایک چھوٹی سی بستی ہے بازید پور،(جو پہلے ایک مضافاتی قریہ تھا،اب گاؤں ہے)اسی گاؤں میں ایک زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے شیخ سخاوت حسین،مولانا عبدالصمد رحمانی انہیں کے صاحب زادے تھے۔

حلیہ:

طویل قد وقامت، گندمی رنگ، چھریرا بدن، آنکھیں چھوٹی، داڑھی اور سر کے بال گھنے، رعب دار خوبصورت، توانا چہرہ، چھوٹی آنکھیں، گال دھنسا ہوئے، آہستہ گفتگو فرماتے، اور معمولی کپڑے زیب تن کرتے۔

ولادت:

آپ کی ولادت بازید پور قصبہ باڑھ ضلع پٹنہ میں ایک معزز گھرانے میں ہوئی،(نقیب 21 مئی 1973ء ص 16) یہی آپ کا آبائی وطن ہے،شادی کے بعد یہاں سے مانڈر ضلع مونگیر (موجودہ ضلع کھگڑیا) میں بس گئے، شاہد رام نگری نے ہفت روزہ نقیب امارت شرعیہ (17 ربیع الثانی 1393ھ مطابق 21 مئی 1973ء) میں آپ کی سن ولادت 1300 فصلی لکھی ہے،اس کے مطابق 1890 عیسوی اور 1308 ہجری سنہ

پیدائش ہوا، حضرت مفتی ظفیر الدین مفتاحی نے بھی "مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے" اور "امارت شرعیہ: دینی جد وجہد کا روشن باب" میں یہی تاریخ پیدائش لکھی ہے، لیکن مفتی صاحب نے "قرآن محکم" میں لکھا ہے کہ آپ کی سن پیدائش 1307 فصلی ہے۔ جو عیسوی اور ہجری کلینڈر کے لحاظ سے 1897ء مطابق 1315 ھجری ہوگا، یہ والی تاریخ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے، کیوں کہ خود مفتی صاحب کی دیگر دو کتابوں میں 1300 فصلی درج ہے، اور قرین قیاس بھی یہی ہے کہ پہلی بات راجح ہے۔

یتیمی:

آپ کی عمر پانچ سال کی ہوئی، تو آپ کے والد محترم شیخ سخاوت حسین کا سایہء عاطفت سر سے اٹھ گیا، (قرآن محکم۔ص 8) آپ کی والدہ محترمہ بی بی صغریٰ نے پرورش و پرداخت کی، آپ کی تعلیم کا عمدہ انتظام کیا، اور انہیں کی توجہات اور دعاؤں نے وہ تاثیر دکھائی کہ آپ دین کے خادم اور امارت کے نائب امیر بن گئے۔

ابتدائی تعلیم:

آپ کی تعلیم کا آغاز گھر پر ہوا، نورانی قاعدہ اور ناظرہ قرآن گھر پر ہی پڑھا، آپ حافظ نہیں تھے، تھوڑے بڑے ہوئے، تو آپ روزانہ اپنے گھر بازید پور سے قصبہ باڑھ تک پڑھنے کے لئے مولانا حکیم محمد صدیق صاحب کے پاس جاتے، عربی کی ابتدائی کتابیں ہدایۃ النحو تک حضرت مولانا حکیم محمد صدیق صاحب سے ہی پڑھی، حکیم صاحب قصبہ باڑھ میں مطب چلاتے تھے،۔ (حیات سجاد ص۔27)

کانپور کا سفر:

ہدایۃ النحو کا سال 1909ء مطابق 1327ھ تھا، اسی سال درمیان میں تنہا گھر سے نکلے، کانپور کا ٹکٹ لے کر جامع العلوم کانپور پہنچ گئے، اور یہاں تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا، لیکن اجنبیت نے ستانا شروع کیا، چوں کہ بہاری طلباء کم تھے، اسی لئے آپ کا دل نہیں لگا۔ (حیات سجاد ص:27) (ہمارے امیر ص 42)

الہ آباد کا سفر:

قدرت کی جانب سے دل میں الہ آباد کا القاء ہوا، چنانچہ کانپور سے الہ آباد کا رخ کیا، اور مدرسہ سبحانیہ الہ آباد میں وسط سال میں پہنچ گئے، جہاں اس وقت حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کی تدریس کے سلسلے میں بڑی شہرت تھی، حضرت ابوالمحاسن نے امتحان لے کر مدرسہ سے باہر ان کی تعلیم کا نظم فرمادیا، کافیہ تک

پڑھنے کے بعد شرح جامی سے مولانا کے حلقہ درس میں شامل ہوگئے، (حیات سجاد 28) حضرت ابوالمحاسن محمد سجاد امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کے بانی اور جمعیۃ علماء ہند کے بانیین میں سے تھے (تفصیل کے لیے دیکھیں حیات ابوالمحاسن، امارت شرعیہ: دینی جدو جہد کا روشن باب) مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کا سیاسی کارنامہ اور خدمات میں سائمن کمیشن کے بائکاٹ کی تائید، مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کا قیام، انجمن علماء بہار، اور جمعیۃ علماء بہار کا قیام قابل ذکر ہے (تحریک آزادی میں علمائے کرام کا حصہ۔ص:220) 1911ء میں مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کے ساتھ مولانا رحمانی گیا تشریف لائے، (حیات ابوالمحاسن۔ محاسن التذکرہ ص: 142؛ حیات سجاد۔ ص: 1915ء میں دورۂ حدیث شریف سے فارغ ہوئے۔ (قرآن محکم ص12 کے حاشیہ میں)

مفتی اختر امام عادل قاسمی نے محاسن التذکرہ کے حاشیہ میں لکھا ہے: مدرسہ سبحانیہ الہ آباد میں حضرت مولانا محمد سجاد کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوگئے، یہاں کے بعد دیوبند تشریف لے گئے، اور 1332ھ یا 1333ھ مطابق 1913ء یا 1914ء میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی۔ (حیات ابوالمحاسن ص 254)

مولانا طلحہ نعمت ندوی کی مرتب کردہ کتاب "مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ" کے صفحہ نمبر 203 کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ

"مدرسہ سبحانیہ الہ آباد میں حضرت مولانا محمد سجاد سے استفادہ کرکے تکمیل کی"۔

مذکورہ بالا دونوں باتیں بعید از صحت ہیں، کیوں کہ 1913 / 1914ء بلکہ اس کے بعد کے کئی سال کے فارغین وفضلاء دارالعلوم دیوبند میں کہیں بھی مولانا عبدالصمد رحمانی کا نام موجود نہیں، دوسری بات یہ ہے کہ اگر فاضل دیوبند ہوتے، تو مفتی ظفیر الدین مفتاحی اور دیگر قلمکار اس بات کو جلی حروف میں لکھتے، حالاں کہ کہیں بھی ایسا موجود نہیں ہے، اس میں لکھا ہے کہ فراغت 1913 یا 1914 میں ہوئی ہے، یہ بھی درست معلوم نہیں ہوتا ہے، کیوں کہ قرآن محکم کے حاشیہ میں درج ہے کہ "1915ء میں آپ صحاح ستہ کے دورہ حدیث شریف کے درس میں مصروف ومشغول تھے" (ص:15)

حضرت مونگیری کی حلقہ ارادت میں: مروجہ نصاب کی تکمیل کے بعد اصلاح قلب کی خاطر مولانا نے خود کو قطب الارشاد، عالم ربانی حضرت مولانا محمد علی مونگیری سے وابستہ کرلیا، اور انہیں کے دست حق پرست پر بیعت کا شرف حاصل کیا، اور روحانی فیض حاصل کیا۔ (کتاب الفسخ والتفریق ص 26) (نقیب 21 مئی 1973ء ص16)

معقولات کی تعلیم:

اس زمانے میں ہر طرف معقولات کا غلغلہ تھا، آپ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے، صوبہ سرحد (موجودہ مغربی پنجاب پاکستان) کے مشہور قصبہ "غورغشتی" میں معروف معقولی عالم حضرت مولانا قطب الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے فن کے امام سمجھے جاتے تھے، اور ہندوستان بھر میں ان کو شہرت ومقبولیت حاصل تھی، جب آپ درسیات سے فارغ ہوئے، تو ان کی علمی شہرت سن کر 1916ء میں غورغشتی اپنے مسترشد کے اجازت واطلاع کے بغیر ہی چلے گئے، اوران کے پاس رہ کراپ نے ان سے شرح اشارات، شرح مطالع اورمحاکمات جیسی اونچی کتابیں بالاستیعاب پڑھیں، ممکن ہے اس ذوق کی تکمیل میں سالوں مصروف رہتے لیکن آپ کے مرشد قطب عالم حضرت مولانا محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کی خواہش تھی کہ معقولات میں زیادہ وقت نہ لگایا جائے، مولانا عبدالصمد رحمانی تک ان کا یہ جملہ پہونچا کہ، کیا اس کا دماغ خراب ہوگیا ہے؟ جوان کتابوں کے پڑھنے کے لئے وہ وہاں گیا ہے، مرشد کامل کا یہ جملہ سنتے ہی آپ نے کتاب بند کردی، آپ سمجھ گئے کہ مرشدِ کامل کو یہ پسند نہیں، فورا اپنے مشفق استاذ مولانا قطب الدین صاحب کی خدمت میں پہنچ کر درخواست کی کہ اب میں گھر جانا چاہتا ہوں، کیوں کہ مجھے پاگل نہیں ہونا ہے، اور استاذ گرامی قدر کی اجازت و رضامندی سے وہاں سے سیدھے خانقاہ رحمانی مونگیر حضرت شیخ کے پاس آگئے، آپ کے اس جذبہ طاعت سے حضرت مونگیری بہت خوش ہوئے۔ (قرآن محکم) قاضی مجاہد الاسلام قاسمی نے یہی واقعہ تھوڑے الگ انداز میں رقم کیا ہے، ان کے بقول "فراغت کے بعد مولانا رحمانی حضرت مونگیری سے بیعت ہوئے، ابتداء میں علوم معقولہ کی طرف رجحان زیادہ تھا، (محاسن التذکرہ۔ص:254) لہذا شیخ کی اجازت واطلاع کے بغیر منطق کی بعض کتابیں پڑھنے صوبہ سرحد میں کابل سے قریب غورغشتی چلے گئے، یہ مولانا شمس الحق معقولی کا گاؤں تھا، مولانا اپنے وقت میں معقولات کے امام مانے جاتے تھے، مولانا رحمانی نے کچھ کتابیں معقولات کے امام سے پڑھیں، اور مونگیر تشریف لے آئے۔

فرماتے تھے کہ میں نے اپنے مرشد سے ڈرتے ڈرتے کہا کہ معقولات کی بعض کتابیں پڑھنے غورغشتی گیا تھا، حضرت مونگیری نے فرمایا لاحول ولاقوۃ الا باللہ، اس سے کیا حاصل؟ معقولی کے مزار پر جاکے دیکھو، تاریکی محسوس ہوگی، اور ایک محدث یا فقیہ کی قبر پر جاؤ، انوار ہی انوار نظر آئیں گے۔ مرشد کی رائے سامنے آئی، تو مرید نے ارادہ بدل دیا، اور منطق وفلسفہ سے دلچسپی ہٹا کر ساری توجہ قرآن وحدیث اور فقہ پر لگادی۔

(کتاب الفسخ۔ص:26)۔

قاضی مجاہدالاسلام قاسمی صاحب کا یہ مضمون مولانا عبدالصمد رحمانی کی وفات کے اٹھائیس سال بعد لکھا گیا ہے،جس میں درج ہے کہ مولانا رحمانی کے معقول کے استاذ مولانا شمس الحق معقولی ہیں، جب کہ مفتی ظفیر الدین مفتاحی کا مقالہ قرآن محکم کا جزء بنکر مولانا رحمانی کے زمانہ حیات میں 1956ء مطابق 1386ھ میں طبع ہوا، یقیناً آپ نے اسے پڑھا ہوگا، اگر غلط ہوتا تو ضرور تصحیح کراتے ، اسی لئے درست یہی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کے معقولات کے استاد جامع المعقول والمنقول شیخ العلماء حضرت علامہ مولانا قطب الدین رحمۃ اللہ علیہ غورغشتی تھے،"مشاہیر علماء سرحد" میں مرقوم ہے کہ مولانا گل حسن ہزاروی، مولانا قاضی عبدالسجان ہزاروی، مولانا نیاز محمد بنوی، مولانا فضل ربانی متھراوی پشاوری وغیرہم جیسے بہت سے اہل علم نے مولانا قطب الدین غورغشتوی سے استفادہ کیا۔

خانقاہ رحمانی:

1916ء میں اپنے پیرومرشد قطب عالم حضرت مونگیری کی خواہش پر معقولات کی تعلیم چھوڑ کر اپنے شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے ، ابتداء میں آپ کو کتب خانے کی ذمہ داری ملی، کتابوں کے درمیان شب وروز گزارنے سے فکر ونظر میں وسعت پیدا ہوئی، دنیائے علم کے مخفی راز آپ پر مزید روشن ہو گئے، پھر افتاء کا اہم شعبہ آپ نے سنبھالا، اور فقہ وفتاویٰ کا کام احسن طریقے پر انجام دیا، عرصے تک اپنے شیخ ومرشد کے نام آنے والے خطوط کی پیشی کی خدمت آپ ہی انجام دیتے تھے۔آپ انتہائی فعال، ذمہ دار، اور اپنی ذمہ داریوں کے معیار پر پورا اترنے والے انسان تھے۔(قرآن محکم)

مولانا رحمانی نے خانقاہ رحمانی کو اپنا دوسرا گھر بنایا،"کتب خانہ رحمانیہ"ہی میں رہتے ،صرف پڑھنا لکھنا ہی ان کا کام تھا، اور بقیہ وقت مرشد کی صحبت اور خدمت میں گزارتے ۔(کتاب الفسخ ص:27)

درس قرآن:

مولانا رحمانی جامع مسجد مونگیر کے امام بھی رہے، حضرت مولانا کی زمانۂ امامت میں مونگیر کے تعلیم یافتہ طبقہ میں قرآن پڑھنے اور سمجھنے کا ایک ذوق پیدا ہو گیا تھا، مونگیر والوں میں دین کا ذوق، اچھی تقریریں سننے اور اچھی تحریریں پڑھنے کا مذاق مولانا ہی کا پیدا کردہ ہے۔(کتاب الفسخ۔ص:27)

خانقاہ رحمانی میں تدریسی خدمات:

1927ء میں جب جامعہ رحمانی قائم ہوا، تو مولانا رحمانی علیہ الرحمہ اس میں مدرس مقرر ہوئے، مولانا رحمانی نے انجمن حمایت اسلام مونگیر میں بھی درسی خدمات انجام دیں۔ (کتاب الفسخ ۔ص:27)

1917ء میں حضرت مولانا مفتی عبداللطیف صاحب رحمانی صدر شعبہ دینیات عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کی حیثیت سے مونگیر سے حیدرآباد تشریف لے گئے اور ان کے بعد مولانا مونگیری کے صاحبزادگان حضرت مولانا نوراللہ رحمانی صدر جمعیۃ علماء بہار اور مولانا منت اللہ رحمانی امیر شریعت رابع بہار واڑیسہ کی تعلیم کی بات آئی تو یہ خدمت تدریس آپ ہی کو تفویض ہوئی،۔اسی زمانے میں مولانا عبدالصمد رحمانی نے انہیں صرف ونحو اور منطق کی متعدد کتابیں بھی پڑھائیں، آپ ایک اچھے مدرس، اور نرم دل مربی تھے، آپ اپنے ہر کام کو محبت، خلوص، انہماک اور تدبر کے ساتھ کرتے۔ (کتاب الفسخ 27)

ماہنامہ الجامعہ کی ادارت: ایک عرصہ تک خانقاہ رحمانی مونگیر سے شائع ہونے والے مشہور علمی ماہنامہ "الجامعہ" کے مدیر بھی رہے۔

فتنوں کا تعاقب

ان دنوں بہار میں قادیانیت کا فتنہ زوروں پر تھا، پورا صوبہ قادیانیوں، اور عیسائی مشنریوں کی فتنہ انگیزی سے لرز رہا تھا، ایسے وقت میں آپ نے مجدد العلم والعرفان حضرت مولانا مونگیری کی زیرنگرانی ان باطل تحریکوں کے خلاف تحریری وتقریری جہاد میں حصہ لیا، اور اپنی بے بہا علمی وفکری صلاحیتوں سے قرآن وحدیث کی تبلیغ وترویج بھی فرماتے رہے، (نقیب 28 مئی 1973ء) انہیں مخلصانہ اور پیہم کوششوں کا نتیجہ مشرقی ہندوستان سے ان فتنوں کا قلع قمع ہونا ہے۔ (نقیب 21 مئی 1973ء) جب آریوں کی تحریک چلی، اس وقت مولانا عبدالصمد رحمانی خانقاہ رحمانی مونگیر میں تھے، "ردآریہ" میں بارہ رسائل لکھے، "وید کا بھید"، اور "آریہ دھرم کا انصاف" وغیرہ بہت مقبول ہوئے۔ (کتاب الفسخ ۔ص:28)

امارت شرعیہ میں آمد:

جب مولانا سید محمد علی مونگیری 1927ء میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے، اور ملک کی سیاسی تحریک نے پلٹا کھایا، آر پار کی جنگ شروع ہوئی تو اس نازک وقت میں آپ اپنے استاد ورفیق، ہندوستان کے مشہور مفکر عالم دین حضرت مولانا ابوالمحاسن سید محمد سجاد کی ایماء پر خانقاہ رحمانی سے امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ منتقل ہو گئے، (نقیب 21 مئی 1973ء)

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد نے مولانا رحمانی کو امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کا ناظم نامزد کیا، اور دفتری امور کی ذمہ داری آپ کے سپرد ہوئی۔ آپ نے یہاں آتے ہی تنظیم امارت قائم کی، ہر علاقے میں امارت کے نقیب منتخب کئے، مسلم آبادی کو باہم مربوط کرنے کے لئے اور مقامی مسائل ومعاملات حل کرنے کے لئے نقباء کی ذہن سازی کی، انہیں بانئ امارت کی فکر کو آگے بڑھانے کے لئے اور وحدت امت کے لئے تیار کیا، آپ نے اس شرعی تنظیم کی ترقی واستحکام کے لئے اپنی ساری توانائیاں اور صلاحیتیں وقف کردیں، اس کی تحریک کو زیادہ منظم وفعال بنانے کے لئے دونوں ریاستوں کے اہم علاقوں کا دورہ کیا، اور زبان وقلم کے ذریعے فکر امارت کی اشاعت میں اہم کردار کیا، ہر ہر علاقے میں دین ودعوت کا پیغام، اور امارت کے مقاصد کو عام کرنے کے لئے جہد مسلسل کیا۔ (ہمارے امیر۔ص44) (نقیب 21 مئی 1973ء)

جمعیۃ علمائے ہند کے نائب ناظم:

جب جمعیۃ علماء ہند نے سول نافرمانی (حرب سلمی) کی تجویز پاس کی، اور اکابر علماء کی گرفتاری شروع ہوئی تب آپ 14 اکتوبر 1930ء کو جمعیۃ علماء ہند کے نائب ناظم اور مرکزی دفتر کے ذمہ دار اعلیٰ مقرر ہوئے، اس وقت کے سہ روزہ الجمعیۃ 23 جمادی الاولی 1349ھ مطابق 16 اکتوبر 1930ء میں یہ خبر شائع ہوئی کہ حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ علماء ہند نے اپنی گرفتاری کے وقت حضرت مولانا حسین احمد مدنی صدر المدرسین دار العلوم دیوبند کو اپنا قائم مقام نامزد فرمایا اور مولانا نور الدین صاحب نائب ناظم جمعیۃ علماء ہند کی جگہ مولانا عبد الصمد رحمانی کو نائب ناظم مقرر فرمایا، قائم مقام ناظم اس وقت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد تھے، آپ حضرت مولانا ابوالمحاسن، حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی، مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی رحمہم اللہ کی قیادت میں ملی وسیاسی خدمات انجام دیتے رہے، اور بڑی تندہی سے ملک وملت کے پیچیدہ مسائل میں جمعیت علمائے ہند کے پلیٹ فارم سے عظیم خدمات انجام دیں۔ (نقیب 28 مئی 1973ء ص 9) حضرت مفتی کفایت اللہ دہلوی رحمہ اللہ رقم طراز ہیں "صدیق محترم مولانا مولوی عبد الصمد صاحب مونگیری صوبہ بہار کے متدین اور پر جوش کارکن ہیں"۔ (کتاب العشر ص 41)

تھانہ بھون کے فتویٰ کا جواب:

جب آپ جمعیۃ علماء ہند کے نائب ناظم کی حیثیت سے ملی وسیاسی قیادت فرمارہے تھے، اس سیاسی شورو شغب کے بیچ بھی آپ کا قلم رواں دواں تھا، الجمعیۃ کے اس زمانے کے شمارے آپ کی تحریروں کے محافظ ہیں،

دوقومی نظریہ پرتھانہ بھون سے فتاویٰ جاری ہوا، آپ نے اس فتویٰ کا مدلل جواب لکھا، جو الجمعیۃ دہلی میں بیس پچیس قسطوں میں شائع ہوا، آپ نے ادب واحترام کے دائرہ میں رہ کر اختلاف ومخالفت میں فرق ملحوظ رکھا، جواب میں آپ نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مقام بلند، اور عظمت کا بھی خیال رکھا، یہی وجہ ہے کہ مولانا رحمانی کی اس خوبی اور حسن ادب کو تھانوی مکتب فکر سے وابستہ حضرات نے خوب سراہا۔(قرآن محکم ص 11) یہ مقالات دیکھنے یا پڑھنے کا مجھے موقع نہیں مل سکا، لیکن ان کی دیگر تصانیف کے انداز تحریر، اور قوت استدلال کی وجہ سے یقین کامل ہے کہ ان کی یہ کتاب سیاسی فراست کا آئینہ دار ہوگی۔

مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کے ناظم:

1935ء کے ایکٹ کے تحت جب 1937ء میں الیکشن ہوا، تو مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد نے مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کے نام سے ایک جماعت بنائی، اور اس کے نام پر الیکشن لڑا، جیت گئے، اور ساڑھے تین ماہ کی وزارت بھی بنائی، اس مختصر عرصے میں بہار کی سرکاری عدالتوں اور دفتروں میں اردو کو اس کا حق دلایا، اس پورے زمانے میں مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کا پورا دفتر مولانا عبدالصمد رحمانی کے سپرد رہا، جسے آپ نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ چلایا۔(قرآن محکم ص12)(ماہنامہ رفیق علمائے بہار نمبر۔ص142) جس سے آپ کی سیاسی دقت نظری اور انتظامی صلاحیت کا خوب مظاہرہ ہوا۔

الہلال پٹنہ:

انڈیپنڈنٹ پارٹی کا ترجمان اخبار الہلال (پٹنہ) جاری ہوا، تو آپ مولانا مسعود عالم ندوی کے ساتھ اس کے مدیر بھی رہے۔(مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد: ص204)(حیات سجاد ص 1)

نائب امیر شریعت ثانی:

17 شوال 1359ھ مطابق 18 نومبر 1940ء میں حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کی وفات ہوئی، تقریباً چار سال تک نیابت کا یہ عہدہ خالی رہا، مولانا عبدالصمد رحمانی اس منصب کے تمام فرائض اور ذمہ داریاں بحسن وخوبی انجام دیتے رہے، چار سال بعد 8 ربیع الثانی 1364ھ مطابق مارچ 1945ء کو امیر شریعت ثانی نے آپ کو امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کا نائب امیر شریعت منتخب کیا۔ اس وقت حضرت امیر شریعت ثانی مولانا شاہ محی الدین قادری نے یہ فرمان لکھا: ”مولانا سجاد رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد سے ادارہ امارت شرعیہ میں نائب امیر شریعت کی جگہ خالی تھی، عملاً اگرچہ مولانا عبدالصمد صاحب رحمانی ناظم امارت شرعیہ نیابت کے بعض

امور کو انجام دیتے رہے تھے لیکن ضابطہ کے طور پر وہ اس منصب کے لیے مامور نہیں کئے گئے تھے، ان چار سال کے کام نہایت اطمینان بخش ہیں اس وقت بجز اس کے کہ مولانا مرحوم کی مجمع الکمالات ذات سے ادارہ امارت شرعیہ محروم ہے، اور جس کا بدل بظاہر ہندوستان میں نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بحمد اللہ تعالیٰ ادارہ امارت شرعیہ اپنے ہر شعبہ میں بہتر حالت میں ہے، جو مولانا رحمانی کی اہلیت اور ان کی مخلصانہ کارگذاری کا عملی ثبوت ہے۔ ضرورت داعی تھی کہ اس منصب نیات کا جلد ہی اعلان ہوتا مگر مشیت الٰہی کے ہاتھوں مختلف وجوہ کی بناء پر تعویق پر تعویق ہوتی رہی، آج 8 ربیع الثانی 1364ھ یوم جمعہ کو مولانا عبد الصمد رحمانی کا تقرر عہدہ نیابت امارت پر کر دیا گیا۔ کل سنیچر کے دن سے کار ہائے مفوضہ کی طرف متوجہ ہو کر عمل شروع کر دیں۔ ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ وبارك فی امرہ" (امارت شرعیہ: دینی جدوجہد کا روشن باب. ص115)

مولانا رحمانی بانی امارت شرعیہ حضرت ابو المحاسن محمد سجاد کے مزاج شناس اور حقیقی جانشیں تھے، قیام امارت کے ابتدائی زمانے سے ہی مولانا کے ساتھ رہے، نظام امارت شرعیہ کو منتشر ہونے سے بچانے کے لئے آپ کی جد و جہد اور اخلاص وایثار نے بڑا سہارا دیا، آپ کی حکمت عملی اور وسعت ظرفی نے اس ادارہ کو کئی مقامات پر انتشار سے بچایا، آپ کی زندگی امارت کی بنیادوں کو مضبوط کرنے میں گزری، ملت کو درپیش مسائل اور اس کے حل کے لئے جہد مسلسل اور سعی پیہم کا اندازہ لگانا ہو تو مولانا کی تصانیف دیکھئے، لگتا ہے قوم کا درد مولانا کے سینے میں ہر وقت ٹیس مارتے رہتا تھا۔ (دینی جدوجہد۔۔۔ص:114)

آپ ۳۳؍سال تک نائب امیر شریعت کی حیثیت سے قوم وملت کی خدمت کرتے رہے، آپ نے نائب امیر شریعت کی حیثیت سے تین امراء کے دور پائے، فراخ دلی اور خلوص کے ساتھ ملک وملت کی تعمیر وترقی میں مصروف رہے۔

دار العلوم دیوبند کے رکن شوریٰ: 1954ء میں آپ دار العلوم دیوبند کے رکن شوریٰ منتخب ہوئے، اور تا حیات اس منصب پر فائز رہے، اور اکابر کے اس قیمتی اثاثہ کی حفاظت وخیر خواہی میں سرگرم رہے۔ (دار العلوم دیوبند کی جامع ومختصر تاریخ۔ص:756)

تصنیفی خدمات:

مولانا کا اصل ذوق تصنیف وتالیف کا تھا، آپ کی تمام تصانیف علمی جواہر پاروں، اور تحقیقات پر مبنی ہیں، آپ فقہ اسلامی پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے، مولانا کی ناقابل فراموش ایثار وقربانی، بلند و پاکیزہ افکار، اور

صالح خصوصیات، دینی، علمی، ادبی سیاسی، تاریخی، سماجی اور تحقیقی کارنامے جو ہزاروں صفحات پر بکھرے پڑے ہیں، وہ ارباب علم وفن کے ذوق کی تشنگی بجھانے اور شیدائیان دین متین کی روح کو تسکین دینے کے لئے بڑی حد تک کافی ہیں، (نقیب 28 مئی 1973ء ص 9) مولانا کی علمی وتحقیقاتی افکار آپ کی تمام تصانیف میں چمکتی نظر آئیں گی، آپ کے فقہی نکات بے حد اہم اور آپ کی آراء مناسب وموزوں ہوا کرتی تھی، اصابت رائے علمی حلقوں میں مسلم تھی، (نقیب 21 مئی 1973ء ص 16) آپ اونچے درجے کے فقیہ، اور روحانی کمالات کے حامل تھے، (نقیب جون 1973)

آپ کا قلم حق پرستوں پر ہونے والے حملوں کے بالمقابل ایک سنگ گراں اور چٹان تھا، آپ زبان و قلم کے ایک جری سپاہی تھے، آپ کے قلم سے عوام کے دلوں میں عمل کا جذبہ پیدا ہوا۔

حضرت مولانا عبدالصمد رحمانی اپنے وقت کے بڑے علماء اور اصحاب تحقیق میں تھے، اور مختلف علوم اسلامی میں دستگاہ رکھتے تھے، علوم القرآن، فقہ اسلامی، مذاہبِ باطلہ، اور فرق ضالہ کا رد آپ کی تحریر کا خاص موضوع تھا، فکر سجاد سے نہ صرف یہ کہ آپ کو والہانہ تعلق تھا، بلکہ آپ اس فکر کے نقیب وترجمان تھے، چنانچہ حضرت مولانا کے ایماء پر آپ نے "مسئلہ امارت اور ہندوستان" لکھی، جو دار الکفر میں قیام امارت پر بحث و تحقیق کے باب میں حرف آخر کہی جاسکتی ہے، فسخ وتفریق کے احکام کی بابت آپ کا مختصر رسالہ "کتاب الفسخ و التفریق" قضاۃ ومفتیان اور علماء وعوام سبھوں کے لئے دلیل راہ ہے۔ (کتاب العشر والزکوۃ۔ ص 22)۔

نظام قضاء کے سلسلہ میں آپ کی تالیف "آداب قضاء" نہایت اہم ہے، "کتاب العشر والزکوۃ" میں عشر وزکوٰۃ کے شرعی احکام تفصیلی انداز میں بیان کئے گئے ہیں، یہ کتاب بجائے خود آپ کے وسعت مطالعہ، عمق نظر، اور غیر معمولی فقہی بصیرت کی آئینہ دار ہے، "تلخیص الاتقان" اور "تیسیر القرآن" آپ کی نہایت مفید نصابی کتابیں ہیں، جو بہت سے مدارس اسلامیہ میں داخل نصاب ہیں، مدرسہ اسلامیہ شمس الہدی بورڈ سے ملحق مدارسِ عربیہ کے وسطانیہ چہارم کے نصاب میں تیسیر القرآن داخل تھی، یہ کتاب مبتدی طلباء کو بتدریج عربی ترکیب سمجھنے اور پڑھنے کے لئے اچھی کتاب ہے، (کتاب العشر والزکوۃ۔ ص 25)

"تلخیص الاتقان" علامہ جلال الدین سیوطی کی ایک مقبول و جامع کتاب الاتقان فی علوم القرآن کی تلخیص ہے۔

امارت کی فکر تو مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کی ہے، لیکن حضرت مولانا اپنے فکر کو قلم بند نہ کر سکے، حضرت

مولانا عبد الصمد رحمانی نے "ہندوستان اور مسئلہ امارت" اور کتاب العشر والزکوۃ لکھ کر اس فکر کو قلمبند کیا۔ (کتاب الفسخ۔ص28)

مولانا مودودی کے نظریات اور دعاوی سامنے آئے تو آپ نے ان کے رد میں مدلل علمی گفتگو کی، جو کئی جلدوں میں دارالعلوم دیوبند سے شائع ہوئی، "جماعت اسلامی پر تبصرہ میں، مولانا مودودی کے دعاوی، ہندوستانی اسلام اوران کے دارالاسلام اور جدید معنی اسلام اور بنیادی عقیدے پر تنقید ہے۔

"جماعت اسلامی کا دینی رخ" چار جلدوں میں ہے، اس میں مولانا نے مولانا مودودی کی واقعی اور سندی حقیقت، پھر ارتقائی حالت، ان کے مجتہدانہ دعاوی، ان کی مہذب گالیوں، اور قائدانہ اور داعیانہ نوازشات کا نمونہ، اوران کے "اصل اسلامی نصب العین" اوراس کی طرف پیشقدمی کے سیدھے راستہ پر تنقید وتبصرہ۔

ایک جلد میں مولانا مودودی کے تین اصولی نظریئے اور عقائد پر بحث کی گئی ہے، (1) قرآن مجید کے متعلق ان کا کیا عقیدہ ہے؟ (2) انبیاء علیہم السلام کے متعلق ان کا کیا عقیدہ ہے؟ (3) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور امت مسلمہ کے مشن کے متعلق ان کا کیا عقیدہ ہے؟ اس سلسلہ میں ان کی گمراہیوں اور کتاب وسنت کی مخالفت پر روشنی ڈالی گئی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مسلمانوں کو کس سمت کی لے جارہے ہیں۔

(ادارہ نشر واشاعت دارالعلوم دیوبند نے کتاب کے سرورق پر یہ خلاصہ درج کیا ہے)

> "تاریخ امارت" اسلامی ہند کے سیاسی دوراوراس کے انقلابی اور آئینی ماحول کے کیا اثرات مرتب ہوئے، ہندوستان پر امارت شرعیہ کا فریضہ کب عائد ہوا، کس طرح عائد ہوا، اور اکابر امت علماء کرام نے اس فریضہ کی ادائیگی میں کیا قربانیاں پیش کیں، نظام امارت کا لائحہ عمل کیا ہے، اس سلسلہ کی تمام باتیں اس کتاب میں آگئی ہیں، مختصر یہ کہ "تاریخ امارت" 1803ء سے 1941ء تک کی اسلامی ہند کی انقلابی اور آئینی جدوجہد کی تاریخ ہے، اوراپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے۔

(تاریخ امارت کی پشت پر یہ لکھا ہوا ہے، اور راقم نے بھی کتاب دیکھی ہے، انتہائی جامع اور مفصل تاریخ ہے)

مولانا عبد الصمد رحمانی نے اپنے اخیر زمانے میں حضرت اقدس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح پر ایک خاص جہت سے قلم اٹھایا، اور خوب لکھا، خانقاہ رحمانی مونگیر ہی کے کتب خانہ میں بیٹھ کر لکھتے تھے، جب تھک کر باہر نکلتے، تو کبھی کبھی علامہ شبلی کا یہ قطعہ پڑھتے:

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

سیرت پرآپ کی کتاب" پیغمبر عالم صلی اللہ علیہ وسلم" کے نام سے موسوم ہے،جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمومی بعثت اورآپ کی عالمی دعوت کا تحقیقی جائزہ پیش کیا گیا ہے، اسی طرح آپ کی ایک کتاب ہے،" تذکرۃ النبی" صلی اللہ علیہ وسلم اس کتاب میں محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو نرالے انداز میں صفحات کی زینت بنایا گیا ہے،آپ نے انبیاء علیہم الصلاۃ والتسلیم،حضرت آدم علیہ السلام،حضرت نوح علیہ السلام،حضرت ہود علیہ السلام اورحضرت صالح علیہ السلام کے تذکرہ اوران کی زندگیوں کو عام فہم انداز میں لکھا ہے،قوم میں صالح فکر پیدا کرنے کے لئے اس طرح کے بیسیوں رسائل لکھے،" فاطمہ کا چاند"،"صحابہ کی انقلابی جماعت"، ایمان کی باتیں"نماز کی باتیں"اورحج کی باتیں اسی سلسلے کی اہم ترین کتابیں ہیں۔

اسلوب تحریر:

حضرت مولانارحمانی کی تحریر بہت شگفتہ،رواں دواں اورعام فہم ہوتی ہے،(ص26) آپ کا اسلوب تحریر عام ہونے کے علاوہ عالم پسند بھی تھا،کسی تحریر میں مذکورہ بالا دونوں خصوصیات کا جمع ہوجانا نہایت نادر الوقوع ہے، یہ خداداد ملکہ حق تعالیٰ نے مولانا کوعطا فرمایا ہے،مولانارحمانی کا طرز استدلال حضرات اہل علم کی تسکین خاطر کا بھی موجب ہوگا۔(کتاب العشر ص37)

تعداد تصانیف:

مفتی ظفیر الدین مفتاحی کے مطابق آپ کی کل تصانیف کی تعداد سڑسٹھ(67) ہے، کچھ لوگوں نے رسائل کوجوڑ کرسو سے زیادہ تعداد بتائی ہے۔

فن فقہ پر

- (1) کتاب الفسخ والتفریق (صفحات کی تعداد:240۔)
- (2) کتاب العشر والزکوۃ (سنہ اشاعت 1361ء 1941ء)
- (3) ازالہ شبہات از مسئلہ عشروزکوٰۃ (صفحات کی تعداد 131)

- (4) رہبری زکوٰۃ
- (5) زکوٰۃ کا مصرف اور اس کا شرعی نظام
- (6) قضا کے چند اہم مسائل
- (7) نئے تقاضوں کا حل شریعت کی روشنی میں
- (8) آداب قضا
- (9) کتاب القضاء
- (10) قضاء کیا ہے؟ (مولانا عبدالصمد رحمانی اور مولانا منت اللہ رحمانی کے مقالوں کا مجموعہ۔ یہ رسالہ امارت شرعیہ کی لائبریری میں موجود ہے)
- (11) غیر مسلموں کے جان و مال کے متعلق اسلامی نقطہ نظر
- (12) فتاویٰ رحمانیہ (فتاوی حضرت مولانا عبدالصمد رحمانی)

اسلامیات وسیاسیات

- ☆ (13) اسلامی حقوق اور مسلم لیگ (سن اشاعت: 1938ء۔ صفحات: 66۔)
- ☆ (14) ایمان کی باتیں (سنہ اشاعت: 1979ء۔ صفحات کی تعداد 239)
- ☆ (15) نماز کی باتیں (سنہ اشاعت 1954ء۔ صفحات کی تعداد 184)
- ☆ (16) حج کی باتیں
- ☆ (17) ہندوستان اور مسئلہ امارت (سنہ شاعت: 1940ء۔ صفحات 130)
- ☆ (18) خطبات
- ☆ (19) قتل مرتد
- ☆ (20) خطبات جمعہ
- ☆ (21) مقالات امارت شرعیہ (اول)
- ☆ مقالات امارت شرعیہ (دوم)
- ☆ (22) اسلام میں عورت کا مقام۔
- ☆ (23) شرکت کونسل

قرآنیات

رد باطل

ردمودودیت

☆ (42) جماعت اسلامی کا دینی رخ (اول)

☆ جماعت اسلامی کا دینی رخ (دوم)

☆ جماعت اسلامی کا دینی رخ (حصہ سوم) (صفحات کی تعداد 72)

☆ جماعت اسلامی کا دینی رخ (حصہ چہارم)

☆ (43) جماعت اسلامی کے نظریات وافکار

☆ (44) جماعت اسلامی کے دعاوی، طریقہء کار، اور خدمات کا جائزہ

تاریخ وسیر

☆ (45) پیغمبر عالم صلی اللہ علیہ وسلم (؛ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمومی بعثت اور آپ کی عالمی دعوت کا تحقیقی جائزہ (سن اشاعت: 1961ء۔ صفحات کی تعداد 346)

☆ (46) تذکرۃ النبی

☆ (47) تذکرۃ آدم علیہ السلام

☆ (48) تذکرہ نوح علیہ السلام

☆ (49) تذکرۂ ہود علیہ السلام

☆ (50) تذکرہ صالح علیہ السلام

☆ (51) صحابہ کی انقلابی جماعت (سنہ اشاعت: 1969۔ صفحات: 160)

☆ (52) فاطمہ کا چاند

☆ (53) حیات سجاد (سنہ اشاعت 1360 مطابق 1941ء صفحات کی تعداد 158)

☆ (54) تاریخ امارت (سنہ اشاعت 1944ء مطابق 1363ھ صفحات کی تعداد 208)

☆ (55) انتخاب امیر رابع

مفتی ظفیر الدین مفتاحی نے لکھا ہے کہ ان کتابوں اور رسائل کے علاوہ ابھی بہت سے مسودات ہیں، جو زیور طبع سے آراستہ نہیں ہو سکے ہیں، (قرآن محکم) مفتی صاحب نے تین (۳) مقامات پر لکھا ہے کہ مولانا عبدالصمد رحمانی کی کل تصانیف سڑسٹھ ہیں، قاضی مجاہد الاسلام قاسمی نے بھی کہا کہ: آپ کی چھوٹی بڑی کتابوں کی تعداد سڑسٹھ ہے"۔ اور قرآن محکم میں کتابوں کی فہرست بھی دی ہے، اس میں ترپن کتابوں کے نام ہیں، اور راقم

کو اب تک چونسٹھ ۶۴ کتب کے اسماء معلوم ہو سکے ہیں، اور یہ اس صورت میں ہوں گے، جب ایک کتاب کی تمام جلدوں کو الگ الگ شمار کیا جائے، ایک کتاب کی تمام جلدوں کو ایک شمار کرنے کی صورت میں کل ۵۵ تصانیف ہوں گی، قاضی مجاہد الاسلام قاسمی نے لکھا ہے کہ "رد آریہ میں بارہ رسالہ لکھے،" وید کا بھید" اور" آریہ دھرم کا انصاف" وغیرہ مقبول ہوئے"، اگر" آریہ دھرم کا انصاف" اور" آریوں کا خوفناک ایشور" ان دونوں ناموں کو الگ الگ رسالہ مان لیا جائے، اور" ابطال تناسخ " کے دو جلدوں کو ایک شمار کریں تو بارہ رسالے ہو جائیں گے، اور اگر آریہ دھرم اور آریوں کا خوفناک ایشور ایک ہی رسالہ مان لیں تو اس وقت ابطال تناسخ کے دو جلدوں کو دو شمار کرنے کی صورت میں بارہ رسالے ہوں گے۔

آپ کی تصنیفات وتالیفات پر ایک نظر ڈال کر سوچیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کن کمالات سے نوازا تھا، اور آپ کن خوبیوں کے مالک ہیں، جن علماء کو آپ کے نزدیک رہنے کا موقع ملا ہے، وہ اچھی طرح سے واقف ہیں کہ حضرت مولانا رحمانی کی نظر فقہ پر کس قدر وسیع، دوررس اور گہری ہے، اور آپ کتنی جلد مسائل کی تہ تک پہنچ جاتے ہیں"۔ (قرآن محکم۔ص 14) آپ کی چند کتابوں کے علاوہ اکثر کتابیں یا تو نایاب ہیں، یا کمیاب ہیں، قوم کو اس قیمتی علمی ذخیرہ کی حفاظت، اشاعت اور ترویج کی کوشش کرنی چاہیے۔

آپ کے تلامذہ

☆ مولانا سید روح اللہ رحمانی سابق صدر جمعیۃ علماء بہار

☆ امیر شریعت رابع مولانا سید منت اللہ رحمانی

☆ مولانا فضل الرحمان صاحب رحمانی سہرسا، مبارک پور

☆ مولوی عبداللہ صاحب بازید پوری صاحب زادہ حکیم محمد صدیق صاحب رحمۃ اللہ علیہ

☆ مولانا سید محمد ولی رحمانی امیر شریعت سابع

☆ وسعت ظرفی اور حکمت عملی

علم وفضل کے اعلی مقام پر فائز ہوتے ہوئے بھی مولانا کے مزاج میں حد درجہ سادگی، اور خاکساری تھی، ان کی شفقت ومحبت کا انداز ہر کہ ومہ پر برابر تھا، (نقیب 21 مئی 1973ء) مولانا درویش صفت، متواضع مزاج، اور خلوت پسند تھے، شریعت اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پابند، سادگی کے پیکر تھے، (نقیب 21 مئی 1973ء ص 16) اعلی ظرفی اور کشادہ قلبی میں اپنی مثال آپ تھے، فراخ دلی، عالی ہمتی میں منفرد مقام

پر فائز تھے، جب امیر شریعت ثانی حضرت مولانا شاہ محی الدین قادری کا انتقال ہوا، اور امیر شریعت ثالث کے انتخاب کا مسئلہ سامنے آیا، تو آپ نے بڑی حکمت ومصلحت سے انتخاب کا مسئلہ حل کر دیا، اور حضرت مولانا شاہ قمرالدین قادری تیسرے امیر شریعت منتخب ہوئے۔

"جب امیر شریعت ثالث حضرت مولانا شاہ قمر الدین قادری کا انتقال ہوا، اور انتخاب امیر رابع کا مسئلہ سامنے آیا، دعوتی خطوط کی تعداد سات سو تھی، ہندوستان کے ممتاز علماء کو بھی دعوت دی گئی، جن میں حکیم الاسلام قاری محمد طیب قاسمی مہتمم دارالعلوم دیوبند، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی، حضرت مولانا فخر الحسن مرادآبادی صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند قابل ذکر ہیں، اسی طرح دارالعلوم دیوبند کے دو مصری اساتذہ شیخ عبد المنعم النمر، شیخ عبدالعال العقباوی بھی اجلاس میں مدعو تھے، انہوں نے شرکت بھی فرمائی، یہ دونوں شیوخ جامعہ الازہر مصر کی طرف سے دارالعلوم دیوبند میں ادب عربی کی تدریسی خدمت پر مامور تھے۔

24 مارچ 1957ء کو سات سو مدعوئین، ارکان جمعیۃ علماء بہار، اور ارکان شوری امارت شرعیہ کا اجتماع حضرت مولانا ریاض احمد صاحب کی صدارت میں ہوا، سب سے پہلے نائب امیر شریعت حضرت مولانا عبد الصمد صاحب رحمانی علیہ الرحمہ نے اجلاس کے انعقاد کی غرض اور اس کا مقصد بتلاتے ہوئے اعلان کیا کہ" آپ حضرات آزادی کے ساتھ امیر شریعت جیسے اہم منصب کے لئے ایسے بزرگوں کا نام پیش کریں جو اس ذمہ داری کو بحسن وخوبی سنبھال سکی۔

حضرت نائب امیر شریعت کے اعلان پر چار نام پیش ہوئے:

- (1) حضرت مولانا شاہ امان اللہ صاحب سجادہ نشیں خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف پٹنہ
- (2) حضرت مولانا سید شاہ منت اللہ صاحب رحمانی سجادہ نشیں خانقاہ رحمانی مونگیر۔
- (3) حضرت مولانا شاہ نظام الدین صاحب خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف
- (4) حضرت مولانا عبدالصمد رحمانی نائب امیر شریعت۔

حضرت نائب امیر شریعت نے اپنا نام واپس لے لیا، اور فرمایا کہ اسے خارج از بحث سمجھا جائے، پھر آپ نے اجلاس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا یہ سب نام ایسے پیش کئے گئے ہیں جن کا احترام صوبہ بہار میں ہر طبقہ کرتا ہے، اس لئے اس اجلاس میں ناموں کی وجہ ترجیح پر بحث نہ کی جائے، اور ایک سب کمیٹی بنادی جائے، جو اس مسئلہ پر بحث کر کے اور متفق ہوکر ایک نام آپ کے سامنے پیش کردے، کمیٹی کی طے کردہ رائے آپ کی

رائے ہوگی۔اور اس کا متفقہ طور پر تجویز کیا ہوا نام اس مشترکہ اجلاس کو منظور ہوگا۔" (امارت شرعیہ: دینی جد وجہد کا روشن باب۔ص127)

بظاہر یہ چھوٹی سی بات معلوم ہوتی ہے کہ مولانا نے اپنا نام واپس لے لیا، دو دو امیر آپ کی نیابت میں امیر شریعت منتخب ہوئے، مولانا منت اللہ رحمانی کی بچے سے جوانی تک علمی وفکری سرپرستی کی تھی، یہ آپ کی وسعت ظرفی کا اعلیٰ ثبوت ہے کہ آپ نے ادارہ کی حفاظت کے لئے اکابر کی روایت زندہ وتابندہ رکھی، آپ کے یہی وہ مخلصانہ محاسن وکردار ہیں، جو آپ کی مقبولیت عامہ کا سبب بنا، امارت شرعیہ کی نیو مضبوط کر گیا،

انہوں نے صرف اپنی ہی قوم وملت کی خدمت نہیں کی؛ بلکہ وہ عالم انسانیت کے لئے شمع ہدایت بن کر سامنے رہے، انہوں نے صرف دنیاوی مسائل کے حل ہی پیش نہیں کئے، بلکہ دین کی راہ پر گامزن ہونے کے لئے تبلیغ واشاعت کا کام بھی انجام دیا۔

شادی:

آپ نے تین شادی کیں: پہلی شادی مانڈر ضلع کھگڑیا میں ہوئی، اور عقد نکاح کے بعد یہیں سکونت اختیار کرلی، ان سے ایک لڑکا ابو صالح، اور ایک لڑکی صالحہ ہوئی، بیٹی صالحہ کا انتقال بچپن میں ہی ہو گیا، مولانا ابو صالح رحمانی جید عالم دین تھے، وہ بھی جواں عمری میں چل بسے، مولانا ابو صالح رحمانی کو دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہوئیں، ابوخطیب اور ابو امجد، اور تین بیٹیاں (1) عالیہ خاتون، (2) رابعہ خاتون، (3) راشدہ خاتون۔ یہ پہلے محل سے اولاد کی تفصیل ہے۔ یہ سب مانڈر میں ہی سکونت پذیر ہیں۔

دوسری شادی واجد پور، شیخ پورہ ضلع نالندہ میں مریم سے ہوئی، اس محل سے دو بیٹے محمد عیسیٰ رحمانی اور موسیٰ رحمانی ہوئے، ایک بیٹی صالحہ ہوئی، محمد عیسیٰ رحمانی کو چار بیٹی اور دو بیٹے ہوئے، (1) اسد رحمانی (2) ارشد رحمانی۔ بیٹیاں (1) شگفتہ (2) شائستہ (3) عظمی (4) شگوفہ۔ دوسری محل کی اولاد باڑھ ضلع پٹنہ میں سکونت پذیر ہیں، اور پھل پھول رہے ہیں۔

تیسرا نکاح لکھنؤ کی بی بی فاطمہ سے ہوا، ان سے صرف ایک لڑکی بی بی عزیزہ خاتون ہوئی، جن کی شادی ماسٹر نہال اختر سے ہوئی ہے۔ آپ کے تمام بچے اور بچیاں خوش وخرم اور خوشحال زندگی گزار رہے ہیں۔

بیماری:

23 محرم 1388ھ مطابق 1968ء میں آپ نے مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی کو خط لکھا، اور فرمایا کہ"

مدتوں کے بعد نئی زندگی پا کر یہ خط لکھ رہا ہوں، خونی بواسیر کا اتنا سخت دورہ تھا کہ اس نے زندگی سے مایوس کر دیا تھا، بدن میں خون نہیں رہنے کی وجہ سے ہاتھ پاؤں چہرہ پر ورم آ گیا، تمام بدن سوج گیا، نشست و برخاست بمشکل ہوتی تھی"۔

اس زمانے میں ضعف و نقاہت اس درجہ ہوگئی کہ لکھنا پڑھنا کم ہو گیا، مفتی صاحب کو خط میں مخاطب کر کے کہا کہ "اب تو تصنیف و تالیف کے کام کا ہی نہ رہا، جڑ کٹ گئی نخل آرزو کی، بس اب یہ حال ہے کہ

بھروسہ نہیں اب بجھا تب بجھا

دم اپنا چراغ سر راہ ہے

اس کے بعد آپ کی طبیعت سنبھل گئی، آئندہ سال پھر طبیعت گڑبڑا، 11 مارچ 1969ء میں مفتی صاحب کو خط لکھا کہ "ایک ماہ پر مونگیر سے آیا ہوں، آپریشن کے سلسلے میں داخل اسپتال تھا، چوں کہ ہسپتال میں بے ہوش کیا گیا تھا، اور تیز دوا سونگھا ئی گئی تھی، دماغ پر اس کا اچھا اثر نہیں ہے، خلا محسوس ہوتا ہے، بس یوں سمجھ لیجئے کہ اب علمی کام کا نہ رہا، نسیان غالب ہے، رکعت بھول جاتا ہوں، اور یاد نہیں رہتا ہے کہ پہلی رکعت میں کون سی سورت پڑھی تھی"۔ (مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے ص 295-299)

مرض کے اسی سرد و گرم میں حیات کٹتی رہی، 20 فروری 1973ء کو آپ مغرب کی نماز ادا کر رہے تھے، کہ کپڑے میں آگ لگ گئی، آپ لمبی کرتی پہنتے تھے، خوف خدا سے معمور، عبادت میں مشغول، محبوب کے خیال میں گم، پیچھے سے آتشدان کی آگ نے کپڑوں کو جلایا، اس کی لپٹوں نے بدن کو جھلسا دیا اور آپ عبادت میں کھوئے رہے، جب کچھ حصہ جل گیا، پیر ہاتھ اور کمر کا بہت سا حصہ بھی لپیٹ میں آ گیا، پھر معلوم ہوا، اللہ اللہ کیا محویت، فنائیت تھی۔ (نقیب 21 مئی 1973ء ص 15)

تقریباً چار ماہ بستر علالت پر رہے، علاج ہوا، اور زخم بھرنے لگے، لیکن کمزوری روز بروز بڑھتی گئی، 29 اپریل کو حضرت امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی نے خانقاہ رحمانی مونگیر بلا لیا، ڈاکٹروں نے نقاہت کا سبب خون کی کمی کو قرار دیا، چنانچہ خون چڑھایا گیا، جس سے حالت کافی سدھر گئی تھی، لیکن 14 مئی 1973ء کو دفعۃً حالت بگڑنے لگی، اور 10 ربیع الثانی 1393ھ مطابق 14 مئی 1973ء روز پیر ساڑھے گیارہ بجے دن خانقاہ رحمانی میں آپ کا وصال ہو گیا، 15 مئی 1973ء کو ساڑھے نو بجے دن میں نماز جنازہ حضرت مولانا منت اللہ رحمانی نے پڑھائی، اور خانقاہ رحمانی کے قبرستان میں اس یادگار سلف کو سپرد خاک کر دیا گیا۔ نور اللہ مرقدہ، ثقّی اللہ ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ۔ (نقیب 17 ربیع الثانی 1393ھ مطابق۔ 21 مئی 1973ء)

شاعری کاذوق:

وفات سے قبل آپ کی لائبریری میں یہ شعرلٹکا ہوا تھا، جو آپ کے اعلیٰ ادبی ذوق پر دلالت کرتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے مولانا صمد تخلص فرماتے تھے۔

محروم کر کے شرف شہادت سے اے صمد
شعلوں نے میرے جسم کو جھٹکا کے رکھ دیا

(نماز کی باتیں۔ص12)

منظوم خراج عقیدت و تاریخ وفات:

آپ کی وفات کے بعد بہت سے عقیدت مندوں نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا، اور قطعہ وفات لکھا۔ جو درج ذیل ہے۔

مراثی بروفات نائب امیر شریعت ثانی
از جناب شہاب شمسی باڑھوی تھانہ مسجد باڑھ

لکھ دو شمسی سال رحلت ان کی آج
نائب میر شریعت چل بسے

1393ھ

قطعہ تاریخ حسن رحلت بروفات فقیہ امت حضرت مولانا عبدالصمد رحمانی نوراللہ مرقدہ
ازحکیم منظرالحسن خادم گاڈھوی مظفرپوری (موجودہ ضلع سیتامڑھی)

یہ لوح تربت بجا ہے خادم یہ آپ حرف جلی میں لکھ دیں
کہ رشک فردوس ہے زمیں پر محب خیر البشر کی تربت

1393ھ

نقش آخریں

حضرت کی کتابیں پڑھیں، تو مزید کتابیں پڑھنے کا اشتیاق ہوا، ان کی تصانیف کی عدم دستیابی نے مجھے کھوج میں لگادیا، ادھر مواد کی قلت نے منہ چڑھایا، اور کھوئے ہوؤں کی جستجو کے شوق نے ولولہ پیدا کیا، پھر کیا

تھا،نشان برگ گل ڈھونڈنا شروع کیا،اس کو پانے اور جاننے کی ضد نے بے چین کر دیا، دستیاب مواد کو پڑھا، تو تجسس وشوق ہل من مزید ہو گیا، پھر احساس ہوا کہ ان کی شخصیت ان الفاظ سے پرے ہے، جو ان کے لئے کہے گئے،ان کے فضل کمال کو لفظوں کی پرکاری کی حاجت نہیں ہے، پھر بھی اس حقیر نے ان کی زندگی کے مختلف گوشوں کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے، چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی داستان کو اکٹھا کیا ہے، روداد پیوستۂ ماسبق کو تازہ کیا، لالہ، نرگس اور گل کے اوراق منتشر سے خوشہ چینی کی، ممکن ہے کہ اس میں زندگی کی بہت سی جہات تشنہ ہوں، اللہ اس پر کام کرنے کی کسی صاحب ذوق و ماہر قلم کو توفیق دے، دراصل مولانا کی ذات ان کاملین میں سے تھی، جو شہر گمنامی کے اسیر ہوتے ہیں، بقول مفتی ظفیر الدین مفتاحی: "اپنی متواضع طبیعت کی وجہ سے گمنامی کی زندگی ہی آپ کو محبوب ہے، اس وقت علماء بہار میں اپنی بعض خصوصیات کے لحاظ سے آخری شخص ہیں، اور علماء ہندوستان میں امتیازی شان رکھتے ہیں" افسوس کہ علم وادب کا یہ خطہ اتنی زرخیزی کے باوجود اپنے محسن کی قدر دانی نہ کر سکا۔

مصادر و مراجع

- حیات سجاد (مولانا عبدالصمد رحمانی ص 27)
- قرآن محکم (مولانا عبدالصمد رحمانی)
- ہندوستان اور مسئلہ امارت (مولانا عبدالصمد رحمانی)
- کتاب العشر والزکوۃ (ایضا)
- کتاب الفسخ والتفریق (ایضاً)
- تاریخ امارت (مولانا عبدالصمد رحمانی)
- نماز کی باتیں (مولانا عبدالصمد رحمانی)
- ہفت روزہ نقیب: ترجمان امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ (17 ربیع الاول 1393ھ مطابق 21 مئی 1972ء۔ ایڈیٹر شاہد رام نگری)
- سہ روزہ الجمعیۃ (23 جمادی الاولی 1349ھ مطابق 16 اکتوبر 1930ء)
- مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے (مفتی ظفیر الدین مفتاحی سابق مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند)
- امارت شرعیہ دینی جدوجہد کا روشن باب (مفتی ظفیر الدین مفتاحی)

○ فتاویٰ امارت شرعیہ جلد اول
○ مشاہیر اکابر ومعاصرین (مفتی ظفیر الدین مفتاحی)
○ سیرت مولانا سید محمد علی مونگیری (سید محمد الحسنی)
○ ماہنامہ رفیق پٹنہ علمائے بہار نمبر (ایڈیٹر محمود عالم، جلد 7، جنوری-فروری 1984، ربیع الاول-جمادی الاول 1404ھ)
○ ہمارے امیر (مرتب: مولانا رضوان احمد ندوی)
○ مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ (مرتب: مولانا طلحہ نعمت ندوی)
○ تذکرہ علمائے بہار جلد اول۔ (مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی)
○ امیر شریعت رابع (حضرت مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانی رحمہ اللہ کی حیات وخدمات)
○ (دارالعلوم دیوبند کی جامع ومختصر تاریخ۔ ص:756)
○ حیات سجاد (مرتب: مولانا انیس الرحمن قاسمی)
○ حیات ابوالمحاسن۔ محاسن التذکرہ (مفتی اختر امام عادل قاسمی)
○ تذکرہ ابوالمحاسن (مرتب: مفتی اختر امام عادل قاسمی)
○ حضرت مولانا عبدالصمد رحمانیؒ - مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی (یادوں کے چراغ جلد پنجم)
○ تحریک آزادی میں علمائے کرام کا حصہ (مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی)

○○○

تجاویز اور سفارشات
اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کا ۳۳واں فقہی سمینار

اسلامک فقہ اکیڈمی کا 33واں فقہی سمینار ملک کے شمال میں واقع ریاست بہار کے مشہور زرخیز، مردم خیز اور تاریخی ضلع سیتامڑھی کے ایک گاؤں بالاساتھ میں واقع جامعہ اسلامیہ قاسمیہ میں مورخہ 6-8/ جمادی الاول 1446ھ مطابق 9-11/ نومبر 2024ء کو منعقد ہوا، اس سمینار میں اندرون ملک سے تقریباً 300/ علماء، ارباب افتاء، دانشوران اور ماہرین فن کے علاوہ بیرون ملک سے بھی متعدد علماء خاص طور پر برطانیہ سے مولانا فاروق احمد قاسمی صاحب شریک ہوئے۔ اس سمینار میں پانچ اہم موضوعات زیر بحث لائے گئے اور بحث و مناقشہ کے بعد متفقہ طور پر فیصلے کئے گئے جو درج ذیل ہیں:

(ا) تجاویز بابت:
علاج ومعالجہ میں کمیشن اور مقررہ تاریخ ختم ہونے کے بعد دواؤں کی فروختگی

۱- ڈاکٹر دوا کی تجویز اور لیباریٹری کے انتخاب میں مریض کی مصلحت کو پیش نظر رکھے، صرف اپنے ذاتی مفاد کی خاطر کسی مخصوص کمپنی یا میڈیکل اسٹور سے دوا لینے یا معین لیباریٹری یا جانچ سنٹر سے ٹسٹ کرانے کا پابند بنانا جائز نہیں ہے۔

۲- دوا یا ٹسٹ پر مطالبہ یا شرط کے ساتھ ڈاکٹر کا کمیشن لینا جائز نہیں ہے، اور شرط یا مطالبہ کے بغیر بھی لے تب بھی جائز نہیں ہے، اگر لے لیا ہے تو صدقہ کردے۔

۳- کسی معتبر ادارے کے ٹسٹ وغیرہ کی رپورٹ محض اس وجہ سے مسترد کردینا کہ وہ ادارہ اس ڈاکٹر کا متعین کردہ نہیں ہے، ظلم اور ناجائز ہے، ڈاکٹر کے لئے ایسا کرنا غیر انسانی وغیر اخلاقی عمل ہے۔ اسی طرح مریض سے بلاضرورت ٹیسٹ کرانا، یا اس کے لئے بلاضرورت دوائیں لکھنا بھی ظلم اور ناجائز ہے۔

۴- اس وقت میڈیکل ٹورزم ایک طبی ضرورت بن چکا ہے، اور صحیح علاج اور مناسب اسپتال تک رسائی کے لئے بسا اوقات میڈیٹر اور مترجم کی ضرورت پڑتی ہے، لہذا میڈیٹر کے لئے مریض کے فائدے کو پیش نظر رکھ کر ماہر ڈاکٹر اور معتبر ہاسپٹل کی رہنمائی اور محنت کرنے پر معروف ومروج محنتانہ لینا جائز ہے، لیکن کسی بھی صورت میں مریض کا استحصال اور اس کے ساتھ دھوکہ حرام ہے۔

۵- دواؤں کے استعمال کے لئے مقررہ تاریخ (Expiry Date) کے بعد اسی دوا کو فروخت کرنا شرعاً ناجائز ہے۔

۶- مقررہ تاریخ کے بعد اگر چہ مضرت کے اعتبار سے دوا اور غذا میں فرق ہے، تب بھی دونوں سے احتیاط کرنا چاہئے، اور اشیاء خوردونوش کے تعلق سے ہر ملک کے قانون کی رعایت کرنی چاہئے۔

۷- ایکسپائرڈ دوا یا غذا سے کوئی نقصان ہوتو فروخت کنندہ اس کا ضامن ہوگا۔

ضروری ہدایات:

(الف) ملک بھر سے آنے والے علماء وارباب افتاء کا یہ وقیع اجلاس حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ علاج انسان کی بنیادی ضرورت ہے اور خدمت ہے، اس کو خالص تجارت بنانے سے روکا جائے، علاج کو سستا کرنے کی کوشش کی جائے، اس جہت سے عوام پر جو ظلم ہورہا ہے اس کا سد باب کیا جائے، اس سلسلہ میں جو ملکی قوانین موجود ہیں، ان کو سختی سے نافذ کیا جائے اور حسب ضرورت عوام کے مفاد میں نئے قوانین لائے جائیں۔

(ب) یہ اجلاس ڈاکٹروں سے بھی مطالبہ کرتا ہے کہ اللہ نے آپ کو ایک معزز پیشہ سے متعلق کیا ہے جو انسانی خدمت کے لحاظ سے بہت اہم ہے، اس لئے آپ مریضوں کے ساتھ ہمدردانہ اور خیر خواہانہ رویہ اختیار کریں، انہیں بے جا طریقے پر زیر بار نہ کیا جائے اور اس بات کا خیال رکھیں کہ شرعی حدود کے دائرہ میں رہتے ہوئے جو کمائی ہو، چاہے وہ کم ہو لیکن اس میں اللہ کی طرف سے برکت ہوتی ہے اور اس میں آخرت کی بھی بھلائی ہے۔

(ج) ہاسپٹل علاج کا مرکز ہے، جو مریضوں کے لئے ایک جگہ ساری طبی ضرورتیں فراہم کرنے کی ذمہ داری ادا کرتا ہے، یہ ایک جائز ذریعہ معاش ہے اور شریعت میں ایسے کاموں کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے، اس لئے اسپتال مالکان کو چاہئے کہ اپنے پیشے کے انسانی پہلوؤں کو سامنے رکھیں، مریضوں کا استحصال جیسے غیر ضروری جانچ، متعین میڈیکل اسٹور سے دواؤں کی فراہمی، بیڈ کے حصول کے لئے زائد رقم وغیرہ کے مطالبہ سے بچیں، اور ایسی باتوں سے بچیں جو شرعاً جائز نہیں ہیں اور ظلم کے دائرہ میں آتی ہیں۔

(د) اسلامک فقہ اکیڈمی کا یہ سمینار امت مسلمہ سے اپیل کرتا ہے کہ بڑی تعداد میں ایسے اسپتال قائم کرنے کی کوشش کریں جن میں اسلامی اصول کی رعایت کرتے ہوئے مریضوں کا علاج کیا جائے۔ انہیں انسانیت کی بنیاد پر علاج ومعالجہ سے متعلق ہر ممکن سہولت فراہم کی جائے، اور اسے خدمت کے جذبہ سے کریں، خالص تجارت نہ بنائیں۔

(۲) تجاویز بابت:

تعلیمی ودعوتی کاموں کے لئے انٹرنیٹ سے استفادہ

آج مورخہ ۱۱؍نومبر ۲۰۲۴ء کو تجویز کمیٹی نے تعلیمی ودعوتی کاموں کے لئے انٹرنیٹ سے استفادہ کے موضوع پر غور کرتے ہوئے درج ذیل تجاویز پر اتفاق کیا:

۱- جائز وصالح مقاصد کے لئے ڈیجیٹل تصاویر کے استعمال کی گنجائش ہے۔

۲- تعلیم جیسی بنیادی ضرورت کے لئے تعلیمی اداروں میں بچوں کو اسکرین پر ریکارڈ شدہ مواد ویڈیو کی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے، بشرطیکہ ویڈیو مخرب اخلاق نہ ہو۔

۳- دینی، دعوتی اور تعلیمی مقاصد کے لئے انٹرنیٹ سے استفادہ کی اجازت ہے، نیز امت مسلمہ کو باطل افکار ونظریات سے بچانے کی خاطر انٹرنیٹ پر ویڈیو کی شکل میں مستند ومفید معلومات نشر کرنا وقت کی ضرورت ہے، اور شرعاً جائز ہے۔

۴- انٹرنیٹ کے ذریعہ کسی مفید وصالح پروگرام کو افادہ عام کی خاطر ویڈیو کی شکل میں محفوظ کرنا جائز ہوگا۔

۵- انتظامی، تجارتی اور دینی مفید میٹنگیں زوم اور گوگل میٹ وغیرہ پر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، نیز اس کی پوری کارروائی کو محفوظ وریکارڈ کرنا جائز ہوگا۔

۶- انٹرنیٹ سے استفادہ کے دوران دینی اور تہذیبی اعتبار سے جو اشتہارات غیر شرعی اور غیر اخلاقی ہیں ان کو روکنے کی جو بھی تدبیر ہوسکتی ہے، اختیار کی جائے؛ خواہ اس کے لئے کوئی فیس ہی کیوں نہ ادا کرنی پڑے۔

۷- کسی جائز پروگرام میں دور تک موجود سامعین کی یکسوئی کے ساتھ استفادہ کی خاطر ٹی وی اسکرین لگانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے؛ خواہ سامعین مرد ہوں یا عورتیں۔

۸- تصویر والی شئ کے استعمال میں تصویر مقصود نہ ہو بلکہ خود وہ شئ مقصود ہو، نیز تصویر والی اشیاء تصویر کے لئے نہیں بلکہ ضرورت کی چیز ہونے کی وجہ سے خریدی جائیں تو اس کی اجازت ہوگی۔

۹-	اشتہارات، بینر، ہورڈنگ وغیرہ پر تشہیر کے لئے جاندار کی تصاویر کی اشاعت جائز نہیں ہے۔ یہ حکم عمومی ہے، خاص کر دینی اداروں اور تنظیموں کو اس سے مکمل اجتناب کرنا ضروری ہے۔

(۳) تجاویز بابت:

موجودہ دور میں فسق سے مراد اور اس پر مرتب ہونے والے احکام

فسق ایک خالص شرعی اصطلاح ہے، اور متعین طور پر کسی کو اس کا مصداق قرار دینے میں نہایت احتیاط کی ضرورت ہے، اس کے ثبوت کے لئے شرعی دلائل کی ضرورت ہوگی، محض ظن وگمان کی بنیاد پر کسی کو فاسق قرار دینا درست نہیں ہے۔

۱-	فسق کا اطلاق گناہ کبیرہ کے ارتکاب یا گناہ صغیرہ کے اصرار پر ہوتا ہے۔

۲-	فاسق کی گواہی پر اگر قاضی کو اطمینان ہو تو رؤیت ہلال یا دیگر معاملات میں اس کی گواہی پر فیصلے کر سکتا ہے۔

۳-	مذہبی اداروں اور تنظیموں کا ذمہ داران ہی لوگوں کو بنانا چاہئے جو دیندار اور پابند شرع ہوں؛ البتہ اگر کسی مصلحت کی وجہ سے کسی غیر دیندار (فاسق) شخص کو بنا دیا جائے یا بزور طاقت از خود بن جائے تو جائز باتوں میں اس کی اطاعت کی جائے۔

۴-	اہل سنت والجماعت کے عقائد کے خلاف کوئی عقیدہ رکھنا فسق فی العقیدہ ہے، اگر ایسے شخص کا عقیدہ کفر تک نہ پہنچا ہو بلکہ فسق تک محدود ہو اور اپنے موافقین کے لئے جھوٹ بولنے کو جائز نہ سمجھتا ہو تو اس کی گواہی قبول کی جا سکتی ہے۔

۵-	فاسق اپنے فسق سے توبہ کرے اور قاضی کو اس پر اطمینان ہو جائے تو اس کی گواہی پر فیصلہ کر سکتا ہے۔

۶-	آپ ﷺ نے داڑھی رکھنے کی بڑی تاکید فرمائی ہے، اس لئے کم از کم ایک مشت داڑھی رکھنا واجب ہے، اس کے باوجود اگر کچھ اہل علم اپنی تاویل وتحقیق کی بنیاد پر داڑھی کی کسی مقدار کو ضروری نہیں سمجھتے تو ان کو فاسق کہنے سے گریز کیا جائے۔

(۴) تجاویز بابت:

مصنوعی ذہانت (AI) سے استفادہ کا مسئلہ

مصنوعی ذہانت جدید ایجادات میں سے ہے اور ابھی ارتقائی مراحل میں ہے، یہ کمپیوٹر سائنس کی ایک

شاخ ہے، جس کے ذریعہ نہایت تیز رفتاری کے ساتھ ایسی معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں، جن کے لئے انسان کو کافی سوچنا اور تحقیق کرنا ہوتا ہے، جدید ایجادات کے سلسلہ میں اسلام کا بنیادی تصور یہ ہے کہ جو چیز شریعت کے خلاف نہ ہو اور انسان کے لئے مضرت رساں بھی نہ ہو، اس سے فائدہ اٹھانا جائز ہے، اور جو چیز شریعت کے خلاف ہو یا انسان کے لئے نقصان دہ ہو اس کا استعمال جائز نہیں، اسی اصول کو سامنے رکھتے ہوئے درج ذیل تجاویز منظور کی جاتی ہیں:

۱- مصنوعی ذہانت کا استعمال فی نفسہ مباح ہے، اگر اسے جائز امور میں استعمال کیا جائے تو کوئی حرج نہیں؛ البتہ شرعی اور قانونی حدود و قیود کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

۲- مصنوعی ذہانت سے استفادہ کرنے میں درج ذیل شرطوں کا خیال رکھا جائے:

(الف) کسی غلط، فحش اور لایعنی چیز کی اشاعت کے لئے اس کا استعمال نہ ہو۔

(ب) تلبیس وتزویر سے مکمل اجتناب ہو، اور انصاف وسماجی وماحولیاتی فوائد اور انسانی بہبود وترقی میں معاون ہو۔

(ج) ملحدانہ مواد داخل (Feed) نہ کیا جائے۔

(د) قتل وقتال اور فساد کا باعث نہ ہو۔

(ہ) دیانت داری، رازداری کے خلاف نہ ہو۔

۳- اے آئی پر موجود معلومات مشترکہ علمی سرمایہ ہے۔ اس سے استفادہ کرتے ہوئے علمی لیاقت کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایسے میں اے آئی مثلاً Chat GPT سے تیار کردہ تحریر اور کتاب پر بہ حیثیت مرتب اپنا نام درج کرنے کی گنجائش ہے؛ نیز اگر کوئی اقتباس بعینہ اس سے نقل کیا گیا ہو تو اس کا حوالہ دینا اور ان معلومات کا حوالہ مذکور ہو تو ان کا تذکرہ کردینا ضروری ہے؛ البتہ اہل علم کو چاہئے کہ خاص طور پر دینی موضوعات پر لکھتے وقت صرف اس پر اعتماد نہ کریں بلکہ اصل مصادر سے رجوع کریں۔

۴- اذان صرف اعلان نہیں؛ بلکہ عبادت بھی ہے اور مشین عبادت کی اہل نہیں؛ اس لئے اذان کے لئے اے آئی کا استعمال جائز نہیں۔

۵- اے آئی کے ذریعہ فون پر ایک شخص کی اپنی آواز میں اس کی نہ کہی ہوئی بات بھی بولی جاسکتی ہے، اور اسی طرح آڈیو اور ویڈیو میں ایڈیٹنگ بھی کی جاسکتی ہے، لہٰذا فون کی آواز اور ویڈیو ریکارڈنگ کو قرینۂ ظنیہ

کےطور پر مانا جائے گا اوراسی کے مطابق احکام مرتب ہوں گے۔

۶- اگر اساتذہ وعلمی کام کرنے والے اور ملازمت پیشہ افراد اے آئی سے استفادہ کرتے ہوئے اپنا فریضہ انجام دیں تو بھی اجرت کے مستحق ہوں گے؛ البتہ اگر اے آئی سے استفادہ نہ کرنے کی شرط لگادی گئی ہو تو اس سے اجتناب لازم ہوگا۔

(۵) **تجاویز بابت:**
خواتین کی ڈرائیونگ سے متعلق بعض مسائل

اسلام نے خواتین کوعزت واحترام کا مقام عطا کیا ہے اور تقسیم کار کے اصول کے مطابق بنیادی طور پر گھریلو امور کی ذمہ داری خواتین پر اور بیرون خانہ کسب معاش وغیرہ کی ذمہ داری مردوں پر عائد کی ہے، اسی لئے شریعت کی نگاہ میں بلاضرورت خواتین کے لیے گھر سے باہر نکلنا پسندیدہ عمل نہیں ہے اور انہیں کسب معاش کے لئے مجبور کرنا بھی جائز نہیں ہے؛ لیکن خواتین کو بھی بعض مواقع پر مختلف ضروریات کے تحت گھر سے نکلنا اور سفر کرنا پڑتا ہے، ان پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے درج ذیل تجاویز منظور کی گئیں:

۱- حسب ضرورت خواتین کے لیے گھر سے نکلنا اور سفر کرنا درست ہے۔

۲- خواتین کے لیے جس طرح گھر سے باہر شرعی پردہ میں پیدل چلنا درست ہے اسی طرح شرعی حدود میں بوقت ضرورت اپنی گاڑی، اسکوٹی وکار چلانا بھی درست ہے۔

۳- اگر مسافت شرعی کی مقدار کا سفر ہو اور اسکوٹی اور کار میں عورت کا شوہر یا محرم بھی ساتھ ہو تو بوقت ضرورت خواتین کے لیے ڈرائیونگ کی گنجائش ہے۔

۴- اندیشۂ فتنہ، بے پردگی اور شرم وحیا کے خلاف ہونے کی وجہ سے اور سد ذرائع کو ملحوظ رکھتے ہوئے خواتین کے لیے پبلک ٹرانسپورٹ مثلاً بس، لاری، ٹرین، جہاز وغیرہ کی ڈرائیونگ ممنوع ہے، اسی طرح خواتین کے لیے ٹی ٹی اور کنڈیکٹر کی ملازمت بھی ممنوع ہے۔

۵- اگر شرعی حدود وقیود کی رعایت ممکن ہو تو خواتین کے لیے ریلوے اور ہوائی جہاز کا ٹکٹ بنانے کی ملازمت کی گنجائش ہے ورنہ نہیں۔

○○○

المعہد العالی الاسلامی کا فکری امتیاز اور اعتدال

- اہل سنت والجماعت کے معتبر شارحین کی آراء پر استقامت۔
- اشاعرہ، ماتریدیہ اور حنابلہ تینوں مکاتبِ فکر کا احترام۔
- عقیدۂ توحید میں ان تشریحات کی پابندی جو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے اختیار فرمائی ہے۔
- سلفِ صالحین کے درمیان اعتقادی و فروعی مسائل میں جو اختلاف رائے رہا ہے، اس میں توسع اور ولی اللہی طرزِ فکر کی پیروی۔
- اہل قبلہ میں سے کسی گروہ کو کافر یا فاسق قرار دینے میں خوب احتیاط۔
- مخالف نقطۂ نظر کے مقابلہ میں تحمل، اختلاف رائے کے باجود احترام اور ملت کے مشترکہ مسائل کے لئے اشتراک۔
- علومِ ظاہری کے ساتھ ساتھ تزکیہ واحسان کی جامعیت۔
- برادرانِ وطن میں دعوتِ دین اور دفاعِ اسلام کی طرف خصوصی توجہ۔
- زبان وبیان اور سلوک ورویہ میں اعتدال۔
- مناظرہ اور طنز وتشنیع کی بجائے نصح ومحبت کے ساتھ اصلاح ودعوت۔

دارالتربیۃ اور کتب خانہ کی مجوزہ عمارت، جس کی تعمیر جاری ہے

دارالتربیۃ اور کتب خانہ کی زیر تعمیر عمارت کا ایک خوشنما منظر

RNI No: 1219775, RNI Tile-Code: APURD01946